MULTILINGUAL & MULTIDISCIPLINARY PEER REVIEWED
REFEREED MONTHLY MAGZINE FROM QILA-E-GOLCONDA,
HYDERABAD, DECCAN

ISSN:2454-4035

انوار تحقیق

Volume Seventh
January-june 2020

شمارہ : 6-1
قیمت ۵۰ روپے

Editor
سید الیاس احمد مدنی

ADDRESS
9-10-380,-NEEM BOWLI MASJID, MACHORA HOUSE, GOLCONDA FORT, HYDERABAD,
TELANGANA - 500008 -

MULTILINGUAL & MULTIDISCIPLINARY PEER REVIEWED
REFEREED MONTHLY MAGZINE FROM QILA-E-GOLCONDA,
HYDERABAD, DECCAN

ISSN:2454-4035

ANWAR-E-TAHQEEQ

Volume Seventh
January-june 2020

Issue : 1-6
Price: Rs. 50/-

Editor
Syed Iliyas Ahmad Madni

ADDRESS
9-10-380,-NEEM BOWLI MASJID, MACHORA HOUSE, GOLCONDA FORT, HYDERABAD,
TELANGANA - 500008 -

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۷ شمارہ۔۱ تا ۶ جنوری تا جون ۲۰۲۰ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰روپئے سالانہ:۔۵۰۰روپئے

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

نگراں:۔**پروفیسرعزیز بانو**، صدر شعبہ فارسی، مانو، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔**سیدالیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھوراہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔500 008

موبائل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹرشاہدنوخیزاعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹرمحمدعقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹرصولت علی خان۔ڈائرکٹراے پی آر آئی ٹونک

ڈاکٹرمحمدقمرعالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمدتوصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ

احمدنویدیاسرازلان حیدر

مدیرسہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری، لکھنؤ

ارمان احمد

مدیرسہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیرسالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

ڈاکٹرای اے حیدری۔صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ لوہیا کالج چورو

متھی علی خان۔نامہ نگارروزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

عباس حیدرنقوی، رسرچ اسکالر، اے ایم یو، علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسرمسعودانورعلوی۔شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسرعمرکمال الدین۔شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

پروفیسرسیدحسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسرسیدمحمداسدعلی خورشید۔صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

پی انورادھاریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹرزرینہ پروین۔ڈائرکٹرآف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹرسیدمحمداصغرعابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

احمد علی، کیپرمینسکر پٹ۔سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹرسیدہ عصمت جہاں۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹرایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استادخطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشورجھن جھن والا، ماہرمسکوکات، ممبئی

امر بیرسنگھ۔ماہرمسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	ضیاءِ تصوف			۳
۲۔	انشائیہ اور آزادی کے بعد کے نمائندہ انشائیہ نگار	(اردو)	ڈاکٹر ای اے حیدری	۴
۳۔	منشی دیبی پرشاد بشاش کا ''تذکرہ شعرائے ہنود	(اردو)	ڈاکٹر ریحان حسن	۱۷
۴۔	چاند بہاری لال صبا جے پوری۔ایک مطالعہ	(اردو)	ڈاکٹر سید محمد ارشد رضوی	۲۲
۵۔	بیکانیر میں اردو ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات		ڈاکٹر شکیلہ بانو	۲۵
۶۔	آنندرام مخلص کا تذکرہ شعراء	(اردو)	صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خاں	۳۶
۷۔	شاعری کی کایا پلٹ ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ	(اردو)	ڈاکٹر ارشد سراج	۴۲
۸۔	انیس شناسی کا علم بردار: ضمیر اختر نقوی	(اردو)	ڈاکٹر حسن مثنیٰ	۵۰

ضیاءِ تصوف

عالموں نے بیان کیا ہے کہ دس چیزیں عمر میں اضافہ کرتی ہیں۔

بہت زیادہ صدقہ دینا۔ بہت زیادہ دعا کرنا۔ ماں باپ کی فرمانبرداری کرنا۔

رات میں نماز پڑھنا۔ نماز جماعت کی مداومت (پابندی) کرنا۔

کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔ قرآن مجید کے معانی سمجھنا۔

خداتعالیٰ کو یاد کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا۔

(رسالہ کنوزالرموز فارسی سے اردو ترجمہ صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خاں)

عالموں نے بیان کیا ہے کہ دس چیزیں حشمت و رفعت کا سبب ہیں۔

بہت زیادہ اطاعت و اعبادت کرنا۔ کثرت سے تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آنا۔

وفاوکرم برقرار رکھنا۔ سحر خیز ہونا۔ صبح و شام سخاوت کرنا۔

تمام کاموں میں جدوجہد کرنا۔ نیک لوگوں کی صحبت لازم پکڑنا۔

شریروں کی صحبت سے پرہیز کرنا۔ کثرت سے مغفرت چاہنا۔

اسرار محفوظ رکھنا۔

(رسالہ کنوزالرموز فارسی سے اردو ترجمہ صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خاں)

انشائیہ اور آزادی کے بعد کے نمائندہ انشائیہ نگار

ڈاکٹر ای اے حیدری ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو گورنمنٹ لوہیا پی جی کالج چورو راجستھان

مغربی ادب کے زیر اثر جو اصناف اردو ادب میں داخل ہوئیں ان میں انشائیہ بھی شامل ہے انشائیہ انگریزی لفظ Essay کا قریب المعنی ہے Essay کے لئے اب تک اردو میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان میں قریب ترین لفظ یہی ہے۔ ہماری زبان میں اس صنف ادب کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ہمارے یہاں عموما Essay کے لئے مضمون کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن مضمون کے زمرے میں مذہبی، سیاسی، سماجی مضامین سے لے کر علمی وادبی و تحقیقی غرض ہر طرح کے مضامین آجاتے ہیں لیکن ہم انہیں ادبی مقام نہیں دے سکتے، کیوں کہ یہ ادبی معیار کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، ان کے اندر مواد ہوتا ہے اور ان کی اپنی ہیئت ہوتی ہے ان مضامین کی افادیت بھی مسلم ہے لیکن یہاں سارا زور بات کو عالمانہ انداز سے کہنے اور معلومات فراہم کرنے پر صرف ہوتا ہے اسی لئے غور وفکر کا دامن ایک لمحہ کے لئے نہیں چھوڑا جاتا، ذہنی فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، سنجیدگی اس کی پہلی و آخری شرط ہے۔ طنز ومزاح اس کو مجروح کر سکتے ہیں۔ اس میں بات کہنے کے انداز سے زیادہ بات کی اہمیت ہوتی ہے لیکن ادب کے کچھ اور بھی مطالبے ہوتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے مطابق 'برسوں تک اردو ناقدین اور محققین یہی طے نہیں کر سکے کہ انگریزی کی ایک معروف صنف ادب Light Essay کو اردو میں کیا کہنا چاہئے بڑی ردوکد کے بعد انشائیہ کا لفظ منظور ہوا' کیوں کہ انشائیہ کافی حد تک Essa کے معنی ومفہوم کو ادا کر دیتا ہے۔ احتشام حسین ٹانڈوی کے مطابق وزیر آغا نے خود کو اس اصطلاح کا موجد قرار دیا ہے جب کہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شاہ علی اکبر قاصد کے مضامین کا مجموعہ ترنگ کے مقدمہ میں ۱۹۴۵ء میں اختر اورینوی نے پہلی بار اس نثری اسلوب کو انشائیہ کے نام سے موسوم کیا۔

انشائیہ میں ہمیں مضمون نگار کا شخصی انداز ملتا ہے۔ یہاں مصنف اپنی شخصیت کی مہر لگاتا ہے۔ انشائیہ نگار ادیب ہوتا ہے اور ادیب ہونے کے رشتے سے وہ زندگی کا نقاد اور اس کا مبصر ہوتا ہے، اس لئے وہ انشائیہ لکھتے وقت بھی زندگی سے بے نیاز نہیں رہتا، وہ اس سے الجھتا اور اس کو سلجھاتا رہتا ہے وہ دنیا کو دیکھتا ہے لیکن اس کا اظہار اپنے انداز سے کرتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کو غیر جانب داری سے پیش کرتا ہے اور حقیقتوں کا غیر جذباتی تجزیہ کرتا ہے۔ انشائیہ میں انسان اپنے تجربے اپنے انداز سے بیان کرتا ہے اور یہ تجربے اس کے داخلی احساسات کا ایک جزو بن جاتے ہیں، جہاں واقعات سے زیادہ واقعات کے ردعمل سے سروکار ہوتا ہے مولانا صلاح الدین احمد نے انشائیہ کے بارے میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ 'انھیں کو پڑھ کر ناظر کی کیفیت اس بچے کی سی ہو جاتی

ہے جواسکول میں دیر سے پہنچا ہواور جس نے گھر کا کام بھی نہ کیا ہولیکن اس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کے بجائے الٹے برفی اور قلاقند کے دو بڑے لفافے تھما دیئے جائیں'

انشائیہ کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔انشائیہ کی محفل ایک بزم بے تکلف ہے جہاں انسان اپنے دل کی بات مزے لے کر بیان کرتا ہے اس کے لئے کوئی پابندی نہیں کہ یہ کہے اور وہ نہ کہے،اسی لئے انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں،اس کی تکنیک کے بندھے ٹکے اصول بھی نہیں ہیں۔انشائیہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا،چنانچہ انشائیہ لکھنے والا اپنی بات کہنے کے لئے کوئی ڈھانچہ نہیں بناتا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ لکھنے والے کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے اور چست وتنگ لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہوکر حقے کی نے ہاتھ میں لئے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہوجاتا ہے' یہاں ادب کے میکانیکی عمل سے ہٹ کر زندگی کا مطالعہ نظر آتا ہے اور اس کام میں لکھنے والے کی اپنی داخلی کیفیت رہ نما بن جاتی ہے۔

انشائیہ نگار زندگی کا نقاد بھی ہوتا ہے اور مبصر بھی اسی لئے وہ انشائیہ کے ذریعے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے یہ اور بات کہ اس کا مقصد اصلاح یا کسی مشن کی تبلیغ نہیں ہوتا،اس نے زندگی کو جس طرح برتا اور جس رنگ میں دیکھا ہے اسے وہ اپنی تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کردیتا ہے البتہ چوں کہ اس کا مقصد زندگی کی تفصیلات نہیں اس لئے اختصار اور اختصار میں جامعیت اس کا اصول بن جاتا ہے وہ بات کو پھیلاتا نہیں لفظوں کو چباتا نہیں خیالات کا تجزیہ کرنے کے لئے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علاحدہ نہیں کرتا گویا انشائیہ کا فن غزل گوئی کا فن ہے جہاں ایک شعر کے اندر ایک خیال سما جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسنین نے مقالے انشائیہ کا مقابلہ کرتے وقت صحیح لکھا ہے کہ'انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ چیز پالیتے ہیں ایسی شئے جو روز آنہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھ سے روپوش رہتی ہے' انشائیہ میں ایسے تجربات کا ہونا ضروری ہے جن سے روز مرہ کی صداقت ابھر کر سامنے آتی ہو۔عام آدمی راہ میں پیش آنے والی جن باتوں کو نظر انداز کردیتا ہے انشائیہ نگار انہی پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور اسے پڑھ کر عام آدمی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تو میری نظر سے بھی گزرا تھا

انشائیہ نگار اپنے مضمون کے لئے پلاٹ نہیں بناتا بلکہ ایک خیال اس کے ذہن میں آتا ہے اور اس کے داخلی احساسات اس خیال سے رشتہ قائم کرلیتے ہیں شاید اسی لئے ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کو انسانی دماغ کی ڈھیلی ڈھالی اور بے پرواہ قسم کی اڑان کہا ہے

It is a lose sally of mind

انشائیہ کے وجود میں آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ کسی بھی موضوع پر بغیر کسی اصول اور ضابطے کے اپنے خیالات کا آزادانہ

طریقے سے اظہار کیا جائے اسی لئے انشائیہ نگار پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی ابن کنول کے مطابق اس پر' کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا' والی مثل پوری طرح صادق آتی ہے'

انشائیہ نگار کو چاہئے کہ وہ اپنے انشائیے کو خیالات سے زیادہ بوجھل نہ بنائے ورنہ اس کی حیثیت مضمون کی ہو جائے گی۔اس کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس بات پر زور دیا جائے اور کسے یونہی رواروی میں بیان کر دیا جائے۔بقول نظیر صدیقی یہ وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں اور اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا موضوع سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے۔

انشائیہ اپنے مصنف کی شخصیت کا صحیح عکس ہوتا ہے اور اس کا اپنے مصنف سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتہ ہر لفظ کی تہہ میں نظر آتا ہے اسی لئے انشائیہ کوئی ایسا میدان نہیں جس کی پیائش کے حدود مقرر کئے جا چکے ہوں۔یہاں کھیل شروع ہونے کے بعد ریفری کی سیٹی بجنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔یہاں لغزشیں بھی حسن بن جاتی ہیں کیوں کہ یہاں بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں ہر انشائیہ اپنا اصول خود وضع کرتا ہے کیوں کہ یہاں بات سے زیادہ بات کہنے کے انداز کی اہمیت ہوتی ہے۔ہر انشائیہ اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ عہد اس انشائیے میں سے جھلکتا رہتا ہے،اسی لئے ہر انشائیہ مختلف ہوتا ہے اور انفرادیت اس کی اولین شرط ہے۔

انشائیہ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بہت آسان ہے ایک اچھے انشائیے کو پڑھ کر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات تو ہم بھی لکھ سکتے تھے لیکن واقعی اگر لکھنے بیٹھیں تو اسے معلوم ہو کہ لکھنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے کیوں کہ ذرا سا بہکنے پر انشائیہ اپنی ہیئت کو کھو سکتا ہے نیاز فتح پوری نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انشائیہ نگاری دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں آسان بھی ہے اور مشکل بھی،آسان اس لئے کہ وہ صرف ذہنی اپج ہے اور مشکل اس لئے کہ ہر ذہنی اپج انشائیہ نہیں ہو سکتی،اس کے لئے محض فکر کافی نہیں ذکر بھی درکار ہے جو آسان نہیں۔

اردو ادب میں انشائیے کی جھلکیاں ہمیں مرزا غالب،محمد حسین آزاد،عبدالحلیم شرر،مہدی افادی،سجاد انصاری،ناصر علی حسن نظامی،فرحت اللہ بیگ،رشید احمد صدیقی،مولانا ابوالکلام آزاد،پطرس بخاری،فلک پیما،کرشن چندر،اور کنھیا لال کپور وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔مگر صحیح معنوں میں انشائیہ نگار کوئی بھی نہیں ہے۔ان میں کوئی مزاح نگار نظر آئے گا کوئی طنز نگار،کوئی خاکہ لکھ رہا ہے تو کوئی اپنی انشائیہ پردازی کو خطوط نگاری میں صرف کر رہا ہے لیکن انشائیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تو ہے کہ ان میں یکسانیت نہیں ہوتی۔میرے خیال میں انشائیہ کے معاملے میں اتنے سخت احتساب کی ضرورت نہیں،کیوں کہ فنی تخلیقات کے لئے ہم جو یہ خانے بناتے ہیں اس میں محض اپنی سہولت مدنظر ہوتی ہے۔

محمد حسین آزاد کے نیرنگ خیال کے بعض مضامین انشائیے کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کی انشائیہ لکھنے کی نیت نہ تھی مگر ان کا شخصی انداز، دل کی بات کہنے کی تڑپ انہیں انشاء پرداز بنا دیتی ہے۔ سرسید ریفارمر تھے مقصدیت پر نظر تھی اس لئے ان کے انشائیوں میں داخلیت کا عنصر کم ہے، پھر بھی ذہانت کے سبب بحث و تکرار اور امید کی خوشی جیسے انشائیے ان کے قلم سے نکل گئے۔

شرر، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور کنھیا لال کپور وغیرہ اردو کے اچھے انشاء پردازوں میں ہیں حالانکہ ان میں سے زیادہ تر طنز و مزاح نگار ہیں مگر ان سب کے یہاں انشائیوں کا عنصر نمایاں ہے۔

آزادی کے بعد انشائیہ لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جن کا احاطہ اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں اس لئے نمائندہ انشائیہ نگاروں کی خدمات کا ایک خاکہ پیش کرنے کی سعی کی ہے

آزادی کے بعد افق انشائیہ پر نمودار ہونے والے افراد میں نمایاں ترین نام رشید احمد صدیقی کا ہے۔ انشاء پرداز کی حیثیت سے فقرے تراشنے، بات سے بات پیدا کرنے، شعر و ادب کے حوالوں سے نئے نقش و نگار بنانے اور قول محال یا دو بظاہر مختلف چیزوں میں تشبیہ کا تعلق ڈھونڈھنے میں رشید احمد صدیقی مہارت رکھتے ہیں، انہوں نے زندگی کے گہرے مشاہدے، دردمندی و دل سوزی کے جذبات کے بجائے اپنے ادبی ذوق، افتادِ مزاج اور علی گڑھ کے مخصوص معاشرے پر زیادہ بھروسہ کیا، جس کے نتیجہ میں ان کے انشائیوں آفاقیت نہ پیدا ہو سکی وہ اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود ایک مخصوص و محدود دائرے میں ہی سمٹے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر کی یہ رائے کسی حد تک متوازن معلوم ہوتی ہے کہ 'رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تانا بانا، انشائیہ نگاری کی اس طرز نے تیار کیا جسے یلدرم، بجنوری، مہدی افادی اور سجاد انصاری نے پروان چڑھایا تھا، بجنوری، مہدی افادی اور سجاد انصاری تینوں قول محال سے کام لیتے ہیں، رشید صاحب نے اسی اسلوب کو پختہ تر کیا'

رشید احمد صدیقی متاخرین میں اردو کے سب سے زیادہ قد آور مزاح نگار تھے، جن کی انشاء پردازی اور اسلوب کی انفرادیت میں کلام نہیں مگر اکثر ان کی انشاء پردازی، ان کی شگفتہ نگاری پر غالب آ جاتی ہے۔ اس کے باوجود گواہ، چارپائی، ماتا بدل اور پاسبان وغیرہ کا شمار ان کے نمائندہ انشائیوں میں کیا جا سکتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاح میں صرف آگہی اور بصیرت ہی نہیں، اسلوب کی رمز شناسی اور تہہ داری بھی ہے۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ چراغ تلے ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کی ابتدائی تحریروں پر کہیں کہیں ان کے دو اہم بزرگ معاصر مزاح نگاروں پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کا پرتو دکھائی دیتا ہے مگر ان کی بعد کی تحریروں میں خود ان کا اپنا انتہائی توانا اور جاندار اسلوب

آب وتاب بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔یوسفی کی تحریروں کے اجزائے ترکیبی میں شگفتہ نگاری،اسلوب کی انفرادیت،تہہ داری،تخلیقی زبان کا فنکارانہ استعمال اورانشاء پردازی شامل ہے

آٹھ عدد خاکوں اورمزاحیہ مضامین پر مشتمل یوسفی کی دوسری تصنیف خاکم بدہن ہے جو۱۹۶۹ء میں منظرعام پرآئی اس کے مضامین میں چراغ تلے کے مقابل زیادہ وسعت، گہرائی اور رنگارنگی ہے اس میں انسانی نفسیات کا مطالعہ پہلے کے مقابلے زیادہ نکھرکرسامنے آیا ہے ان کے اسلوب کی منفردخوبی یہ ہے کہ وہ مروجہ الفاظ وتراکیب کی ذراسی تحریف کرکے ان کو نئے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ان تحریف شدہ الفاظ وتراکیب کو وہ مخصوص سیاق وسباق میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ جملہ چمک اٹھتا ہےاورقاری مسکرائے بنانہیں رہ پاتا،ان کی تحریفات کا یہ سلسلہ خاکم بدہن سے شروع ہوکرآب گم تک پھیلا ہوا ہے۔

جگ بیتی کے بجائے سگ بیتی ،مرشد کامل کے بجائے مرشد کاہل،آپ بیتی کے بجائے پاپ بیتی، دستورالعمل کے بجائے دستورالحمل ،سرگزشت کے بجائے زرگزشت یاخرگزشت،راندۂ درگاہ کے بجائے راندۂ زرگاہ،سرچشمہ کے بجائے شرچشمہ وغیرہ تحریفات وضع کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔زرگزشت سے آب گم تک یوسفی نے تحریفات سے نہایت حسین اورلطیف فقرے ترتیب دیئے ہیں

> ان کی ذات سے چھوٹے بڑے جتنے اسکینڈل ان منسوب تھے،ان سب کے خالق وراوی مضرّی ومہتمم وہ خود ہی بتائے جاتے تھے۔اپنے بارے میں کی گئی بے بنیاد بے قیاس آرائیوں کی وہ ہمیشہ تصدیق کردیتے تھے،اپنی شان میں تمام گستاخیوں اورشرارتوں کا شرچشمہ دراصل وہ خود تھے(۱)

> اور نہ ہمارا حافظہ اتنا چوپٹ ہوا ہے کہ جوش صاحب کی طرح ساری داستان امیرغمزہ سنانے اوراپنے دامن کوخود ہی آگے سے پھاڑنے کے بعد جب جرح کی نوبت آئے تو یہ کہہ کراپنے دعوی عصیاں سے دست بردار ہوجائیں کہ نسیان مجھےلوٹ رہا ہے یارو(۲)

> اگراس زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق دستورالحمل بنایا جاتا تو محمد حسین آزاد کے الفاظ میں یہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشوراجسام کی طرف روانہ ہی نہ ہوتا مطلب یہ کہ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھے(۳)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ مشتاق احمد یوسفی کس طرح الفاظ میں ذراسی تحریف کرکے جملہ میں ایک ایسی شوخی پیدا کردیتے

ہیں کہ قاری یا سامع مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتا۔ ان کی یہی خوبی انہیں ان کے معاصرین میں ممتاز و منفرد کرتی ہے

عاشور کاظمی کی کئی ادبی حیثیتیں ہیں۔ وہ مغرب میں ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون سمجھے جاتے ہیں، جدید مرثیوں پر ان کی دو کتابیں مرثیہ نظم کی اصناف میں، اور اردو مرثیہ کا سفر اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار' منظر عام پر آ چکی ہے اس کے علاوہ ان کے کئی شعری مجموعے صراط مستقیم، بربط احساس، چراغ منزل اور حرف جنوں بھی شایع ہو چکے ہیں، شاعری کے علاوہ انہوں نے طنز یہ و مزاحیہ مضامین کے دوش بدوش انشائیے بھی تحریر کئے ہیں۔ دو مجموعے سخن گسترانہ بات اور چھیڑ خوباں سے انہیں انشائیہ نگار کی حیثیت منوانے کے لئے کافی ہیں

ناوک حمزہ پوری دبستان عظیم آباد کے ایک معتبر ترین شاعر ہیں۔ جذبات نازک، نثار غزل، ترسیل سخن، انداز بیاں، شرار سخن، نوائے امروز وغیرہ ان کے شعری مجموعے شایع ہو چکے ہی لیکن یہی ناوک حمزہ پوری کی متاع حیات نہیں ان کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے انہوں نے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ انشائیے بھی تحریر کئے ہیں دشنامے چند اور کیریئر گائڈنس ان کے انشائیوں کے مجموعے ہیں

خالد محمود مدھیہ پردیش کے ودیشہ ضلع کی تحصیل سر ونج میں پیدا ہوئے حصول تعلیم کے بعد جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے۔ بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر نثر میں بھی ان کی کئی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں، تحریر کے رنگ ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں سنجیدہ مضامین کے علاوہ انشائیے اور نیم مزاحیہ خاکے بھی شامل تھے بعد میں ان کو علاحدہ علاحدہ کر کے ادب کی تعبیر اور شگفتگی دل کی کے عنوان سے شائع کیا۔ شگفتگی دل کی ان کے تحریر کردہ خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے اس میں چار خاکے اور پانچ انشائیے شامل ہیں۔ انشائیوں کے عناوین ہیں سٹی بس کا سفر، آخری قطار، جب اچانک میکے سے، بہشت آنجا کہ اور قلم برداشتہ۔ اس کے علاوہ ان کے خاکوں اور انشائیوں کا ایک اور مجموعہ قوس قزح کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خالد محمود کے انشائیوں میں زبان کے ساتھ بڑی سلیقہ مندی کا سلوک دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کے مطابق 'خالد محمود کا کمال یہ ہے کہ آپریشن کے بغیر الفاظ کے بطن سے معنی کا جوڑا پیدا کر لیتے ہیں، ایک معنی جو سنجیدہ لغت نگار کی ڈکشنری کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا جو شوخ نکتہ داں کے لئے ذکاوت آمیز بصیرت کا سامان بہم پہنچاتا ہے'

خالد محمود کے انشائیوں میں لفظوں کی تراش خراش، تابنا کی اور چکا چوندھ کے نمونے کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں سطحیت اور یکسانیت مفقود ہے ان کے ایک انشائیے سٹی بس کا یہ اقتباس دیکھئے

یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ خدانخواستہ دلی میں قطار میں کھڑے ہونے کا رواج نہیں یقیناً ہے جب تک بس نہیں آتی لوگ نہایت صبر وسکون کے ساتھ صف بنائے کھڑے رہتے ہیں پھر جیسے ہی بس نظر پڑتی ہے پتھروں کے زمانے کی تہذیب جاگ اٹھتی ہے مساوات کا یہ عالم کہ محمود وایاز بس کے ایک ہی دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور ایک ہی دروازے سے اترتے ہیں دلی والوں کو بس میں چڑھنے کا فن بھی خوب آتا ہے بس میں نقب لگا کر داخل ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔یوں بھی سرکاری سٹی بس کو سوار ہونے والوں کی بہ نسبت اترنے والوں کی زیادہ فکر رہتی ہے لوگ اترتے بھی اسی طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو، بار بار بس میں سوار ہونے اور اترنے کی بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ ہر طرح کے لوگ ایک دوسرے میں اس قدر گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ دلی میں زندگی کا بڑا حصہ لوگ بس اسٹاپ پر گزارتے ہیں (۴)

ایک اور انشائیے جب اچانک میکے سے ۔۔ میں بیچارگی کے اظہار کی جو مزاحیہ صورت حال پیدا کی ہے وہ بہت دل چسپ ہے گھر میں مشاعرہ کا اہتمام ہے جس کے نتیجے میں افراتفری کا عالم ہے اور ایسے میں بیوی میکے سے واپس آجاتی ہے اس کے آنے سے جو گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور اس سے نپٹنے کے لئے جو قدم اٹھائے جاتے ہیں اس کا ایک منظر دیکھئے

’سب سے پہلے فرسٹ ایڈ کے طور پر ہم نے جلدی جلدی سب سامان اپنے مقام پر پہنچانے کی ناکام کوشش کی۔ ہمارا یہ عمل ایسا ہی اضطراری تھا جیسے کوئی چور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامان باندھ کر لے جانا چاہتا ہو، چنانچہ ایسے غیر فطری عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو سامان اپنی جگہ برقرار تھا، وہ بھی بے قرار ہو گیا اور جو چیزیں اب تک کسی طرح محفوظ رہ گئیں تھیں وہ بھی خطرے میں پڑ گئیں‘ (۵)

کرنل محمد خاں کی پہلی تصنیف بجنگ آمد ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آئی بعد کو ان کا سفر نامہ بہ سلامت روی ۱۹۷۵ء میں اور بزم آرائیاں ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئیں بجنگ آمد ان کی فوجی زندگی کی داستان ہے جو دوسری جنگ عظیم کی ابتداء سے شروع ہو کر قیام پاکستان تک کے طرح طرح کے واقعات وحادثات، رزم وبزم کی بے شمار رنگینیوں پر مشتمل ہے اس کا امتیازی وصف ان کا شگفتہ وتوانا اسلوب ہے جس کا خمیر ان کی فطری خوش مذاقی اور اردو شعر وادب کے والہانہ لگاؤ سے تیار ہوا ہے۔ وہ ایسے انشائیہ نگار ہیں جو لفظ کو ناپ تول کے استعمال کرتے ہیں پھر بھی ان کے یہاں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ ان کے یہاں ایسی برجستگی اور بے ساختگی ہے جو ان کے عہد کے دوسرے انشائیہ نگاروں کے یہاں بہت کم دکھائی دیتی ہے ان کا درج ذیل اقتباس دیکھئے

ہماری ہر صبح چوبی گھوڑے پر سے کودنے اور رستے پر چڑھنے میں صرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے مرچ اور بدذائقہ ڈنر کی وجہ سے حرام ہوگئی۔ ایکسٹرا ڈرل سے بچنے کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے کی بارہا کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ دیسی کھانے کے لئے باورچی کی ہزار منتیں کیں لیکن بدبخت سارجنٹ کے ڈر سے راضی نہ ہوا۔ جی چاہتا کہ اگر سارجنٹ کو نہیں تو کم از کم باورچی کو ہی قتل کر ڈالیں لیکن اگر اس کی ہمت بھی ہوتی تو فرصت کہاں تھی اور آخر ایک روز فرصت ملی تو معلوم ہوا کہ لیفٹینن ہو گئے ہیں لیکن یہ لیفٹینی ہم پر دوسرے جمعے کو ہی نازل نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کی پیدائش کے لئے ہمیں بیچاری نرگس کی طرح پورے نو مہینے اپنی بے نوری پہ رونا پڑا۔ چنانچہ ہم ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کرنل محمد خاں کی ایک اہم خوبی ان کی باریک بینی ہے جن مناظر کو دیکھ کے عام لوگ یوں ہی گزر جاتے ہیں وہ ان کی گہرائی تک جاتے ہیں اور اس پر پڑے سارے پردے چاک کر دیتے ہیں اور لطف کی بات یہ کہ یہ پتہ تک نہیں چلتا کہ وہ کوئی بہت سنجید موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ بہ سلامت روی یوں تو سفرنامہ ہے مگر یہ سفرنامہ خالص ادبی مزاح اور انشائیہ کا بہترین نمونہ بھی ہے ۱۴۱۳صفحات پر مشتمل اس سفرنامے کو کہیں سے بھی پڑھیں کرنل محمد خاں کا اسلوب آپ کو اپنا گرویدہ بنا کر ہی دم لے گا اس میں آمد ہے آورد نہیں، ایک قسم کی شگفتگی و بے ساختگی ہے جو انشائیہ کی ایک اہم خوبی ہے

اردو ادب میں طنز و مزاح کو اعتبار و استناد عطا کرنے والوں میں مجتبیٰ حسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے انشائیوں، خاکوں، سفرناموں اور اخباری کالموں سے اپنی ایک پہچان قائم کی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے چھ مجموعے تکلف بر طرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، بالآخر اور الغرض اردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ خاکوں کے تین مجموعے آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ اور دو مزاحیہ سفرنامے جاپان چلو جاپان چلو اور سفر لخت لخت منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے انشائیے، خاکے سفرنامے اور ادبی کالم سب ان کی ذہانت و ذکاوت کے مظہر ہیں ان کا پہلا ادبی فکاہیہ' ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں' ساٹھ کی دہائی میں شائع ہوا تھا جس کے بعد سے ان کے فکر و فن کی مختلف جہتیں نمایاں تر ہوتی گئیں اور تحریروں کے ادبی حسن میں اضافہ ہی ہوتا گیا

مجتبیٰ حسین نے زندگی کو ایک عام آدمی کی طرح برتا ہے اسی لئے ان کے فن میں تازگی، زندہ دلی اور روشن فکری کے عناصر بہت واضح ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کے بہترین نباض ہیں اسی لئے ان کے انشائیے انسانی نفسیات کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں وہ صرف لفظوں کی الٹ پھیر سے کام نہیں لیتے واقعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ خود بخود ہنسی کے پھوارے پھوٹ پڑتے ہیں سڑک اور شاعر کا یہ اقتباس دیکھئے

سڑک اور شاعر کا رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ بے ایمانی اور تاجر کا رشتہ،شاعر زندگی بھر سڑکیں ناپتا ہے اور بالآخر سڑکیں ہی شاعر کو ناپ لیتی ہیں ۔پھر اخباروں میں خبر چھپتی ہے کہ ملک کے ممتاز شاعر حضرت طویل بحروی ایک سڑک کے کنارے مردہ حالت میں پائے گئے ۔مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوی اور ایک سڑک چھوڑی ہے خدا ان دونوں کو صبر جمیل عطا فرمائے

مجتبیٰ حسین کا مشاہدہ بہت وسیع اور ان کی نظر بہت عمیق اور دور بین ہے وہ سماجی صورت حال کے ہر پہلو سے واقف ہیں ان کی نظر میں ہر طرح کے افراد ہیں نوکر،افسر، ڈاکٹر، باورچی، دھوبی، رکشا چلانے والے،سنیما کے شوقین، ریس میں گھوڑے دوڑانے والے،شاعر،ادیب، سیاسی بازی گر، طالب علم اور درویش سبھی شامل ہیں مگر ان سب سے بڑھ کر وہ خود اپنے آپ پر قہقہہ لگا سکتے ہیں، بیوی کا مضحکہ اڑا سکتے ہیں اور اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے پردے میں عوام الناس کی ناراضگی سے محفوظ رہتے ہوئے وہ سب ایک سانس میں کہہ جاتے ہیں جو کہنے کے لائق نہیں ہوتا۔وہ اپنے پڑھنے والے کے لئے صرف ہنسی کے سامان مہیا نہیں کرتے بلکہ ان کو غور وفکر پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

ان کی تحریروں میں بے ساختگی و برجستگی ہے، بات سے بات پیدا کرنے کا جو ہنر ہے وہ ان کو طنز ومزاح میں ایک امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔مجتبیٰ حسین کے مزاح کے تین پہلو ہیں، خالص مزاح، طنز آمیز مزاح اور حزنیہ مزاح اور یہ تمام کے تمام پہلو ان کے انشائیوں میں بہت واضح ہیں۔غیر شخصی طنز آمیز مزاح کا یہ نمونہ دیکھئے، ہوٹل شبانہ کے بارے میں لکھتے ہیں

دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ اس ہوٹل میں پہنچ کر بہت چھوٹا ہو جاتا تھا کئی پیچیدہ بین الاقوامی مسائل کے بارے میں یہاں کھٹا کھٹ فیصلے صادر کئے جاتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ان فیصلوں پر عمل کوئی نہیں کرتا تھا مرزا کہتے تھے کہ جب دنیا اقوام متحدہ کے فیصلوں پر عمل نہیں کرتی تو ہوٹل شبانہ کے فیصلوں کو کون سنے گا

لائق ذکر بات یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کے قلم کی تازگی ہر جگہ برقرار رہتی ہے اور ان کی تخلیقی چشمے خشک نہیں ہوتے اس لئے کہ وہ اپنے اردگرد کی عوامی زندگی ،سماج ،ادبی میلانات و رجحانات سے خود کو بخوبی باخبر رکھتے ہیں انہوں نے اپنے مزاحیہ انشائیوں، خاکوں،سفرناموں اور ادبی و سیاسی کالموں سے اردو میں نہ صرف اعلی درجے کی طنز ومزاح کی کمی کو پورا کیا ہے بلکہ فکر ونظر نئے در بھی کشادہ کئے ہیں

آزادی کے بعد ابھرنے والے طنز ومزاح نگاروں میں احمد جمال پاشا کا نام بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے انہوں نے مزاحیہ مضامین کے علاوہ خاکے بھی لکھے ہیں لطیفوں کی کتاب بھی مرتب کی ہے لیکن ان کے دو مضامین ادب میں مارشل لا اور کپورا ایک

تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ان کے شاہکار ہیں ۔ پاشا خود ادیب تھے اور ادیبوں کی محفل میں ہمہ وقت گھرے رہتے تھے اس لئے ان کو ادبی دنیا کے تمام نشیب وفراز ، چالاکیوں ، خامکاریوں اور داخلی سطحیت کا بخوبی علم تھا جس کو انہوں نے اپنے شاہکار مارشل لا میں بطور خام مواد استعمال کیا اور اپنے پیچھے طنز ومزاح کا ایک دل چسپ اور فکر انگیز نمونہ چھوڑ گئے ۔

شام کی خبروں میں گرفتار ہونے والوں کی جو فہرست سنائی گئی تھی اسمیں اچھی خاصی تعداد ان بزرگوں کی ہے جنھوں نے ادب کے منصب اپنے دوستوں رشتے داروں اور ہم وطنوں میں تقسیم کر کے حق داروں کو ان کے حق سے محروم کردیا تھا یہ سب اب فوجی حراست میں ہیں ۔

ایک شاعر رسالہ کو غزل بھیجتا ہوا پکڑا گیا اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ’علامہ‘ اور ’ایشیاء کا عظیم ترین شاعر‘ وغیرہ لکھا تھا اس پر دوسروں سے بھی جبرا اپنے آپ کو عظیم شاعر کہلوانے اور خلاف مرضی تعریفی ادار یئے لکھوانے کے جرم میں مقدمہ قائم کردیا گیا ہے (۶)

یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی مسخ شدہ صورتیں آج بھی دکھائی دیتی ہیں

پاشا کا دوسرا شاہکار کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ہے جو درحقیقت پروفیسر رشید احمد صدیقی ، پروفیسر احتشام حسین ، کلیم الدین احمد ، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور قاضی عبدالودود کے اسلوب کی پیروڈی ہے خاص بات یہ ہے کہ پیروڈی کے پردے میں مذکورہ بزرگوں کے اسالیب بیان کی وہ خامیاں بھی اجاگر کی ہیں جو ان کے اصل مضامین میں اکثر آسانی سے پکڑ میں نہیں آتیں مثلا عبادت بریلوی کے اسلوب میں تکرار اور طول کلام کی جو خامی ہے اس کی پیروڈی پاشا نے ان الفاظ میں کی ہے

کپور کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنز یہ ومزاحیہ ہوتے ہیں ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج بالترتیب پہنچا ہوں ان سے صرف ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے (۷)

پاشا کا ایک اور لائق تذکرہ انشائیہ کتاب کی جلد ہے جو ان کے آخری مجموعے پتوں پر چھڑکاؤ میں شامل ہے یہ مجموعہ پاشا کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آیا تھا ۔ پاشا نے اپنے اس انشائیے میں ایسے ایسے پہلو نکالے ہیں جن سے بے اختیار ہنسی کے پھوارے چھوٹنے کے ساتھ مصنف اور کتاب کے تعلق سے بعض مزاحیہ پہلو بھی اجاگر ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر میرے استاد ڈاکٹر کاظم علی خاں کے انداز مطالعہ کی دلکش منظر کشی ملاحظہ کیجئے

موصوف نے ایک جلد اٹھائی اور اسے کھا جانے والی نظروں سے پڑھا،سناٹے میں آ گئے ،اچھل پڑے ، بڑبڑائے ،مصنف کا شجرہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ حقے سے بیان کیا۔غصے سے بھنویں تن گئیں بکواس کے فلک شگاف نعرے کے ساتھ کتاب اتنے زور سے پھینکی کہ اس کونے میں کتاب اوراس کونے میں جلدگری یا ہاتھ ہی میں رہ گئی پھر کسی دوسرے مخطوطے میں غرق ہو گئے ،کھانے کا وقت گزرنے لگا تو بیگم صاحبہ نے ڈرتے ڈرتے یاد دلایا اتنے زور سے گھڑکا' مجھے غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح کے نواسے کی تاریخ پیدائش نہیں مل رہی ہے اور تمھیں کھانے کی پڑی ہے'(۸)

مذکورہ اقتباس سے پاشا کے مشاہدے کی باریکی عیاں ہے میر مہدی مجروح کے نواسے کی تاریخ پیدائش محض برائے بیت نہیں یہ کاظم علی خاں کے طریق کار کا اعلانیہ بھی ہے

پاشا کی تحریروں میں پستی و بلندی کے دونوں پہلو دکھائی دیتے ہیں جہاں موضوع پر گرفت مضبوط ہے وہاں وہ فنی بلندی پر دکھائی دیتے ہیں اور جہاں وہ محض لکھنے کے لئے لکھتے ہیں وہاں تحریر کی سطحیت بہت واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ جہاں بسیار نویسی نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا ہے وہیں پاشا کے اندر مزاح نگاری کی جو فطری صلاحیت تھی اس کا بھرپور استعمال نہیں ہوسکا ۔جس کے سبب وہ خود اپنے قائم کردہ معیاروں پر پورے نہیں اترتے۔

شوکت تھانوی لکھنو میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی اور لکھنو کے ادبی ماحول میں رچ بس کے لکھنا شروع کیا۔محنت، لگن اور شعر وادب سے فطری مناسبت کے سبب بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ۔آزادی سے قبل پاکستان چلے گئے اور وہیں ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔شوکت تھانوی نے طنز و مزاح کے سبھی حربوں کو آزمایا ہے انشائیہ، ناول،افسانے ، پیروڈی، کیری کیچر ،خاکہ نگاری اور ڈرامہ نگاری وغیرہ میں اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔

شوکت تھانوی بلا کے ذہین ،نکتہ رس اور جدت پسند تھے بات سے بات نکالنے کے ہنر میں ماہر تھے۔ان کے طنز و مزاح میں نوجوانی کی رومان پرور فضاؤں کا عمل دخل دلکشی پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر علی محمد زیدی راجستھان یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ،راجستھان کالج جے پور میں پرنسپل رہے آزادی کے بعد انہوں نے لکھنا شروع کیا تصنیف و تالیف کی دنیا میں مطالعۂ داغ اور مقدمۂ شعر وشاعری خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں تحقیق و تنقید کے علاوہ مزاح نگاری میں بھی انہوں نے اپنی پہچان قائم کی ہے ان کے مزاحیہ مضامین میں آسان اور عام فہم زبان کا استعمال ہوا ہے انہوں نے اپنے انشائیوں میں گھریلو زندگی پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ان کی مضحکہ خیز کیفیت میں پیش کرنے میں انہیں ید طولی حاصل ہے ان کے مضامین کے عناوین سے ہی ان کے موضوع سخن کا پتہ چل جاتا ہے مثلا

یہ عناوین ملاحظہ کیجئے اکیسویں صدی کی بیوی، آج کا ظاہر دار بیگ، کتابی بیوی، شاعرہ بیوی، کاش ہمیں بھی کوئی سلام کرتا، افسر کی کرسی وغیرہ

مختار ٹونکی بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر تحقیق اور تنقید کی دنیا میں بھی دخل ہے اور سب سے بڑھ کر مزاح نگار ہیں ان کے انشائیوں کے تین مجموعے خرافات، اوٹ پٹانگ اور لغویات شائع ہو چکے ہیں۔ وہ عموماً معاشرتی اور ادبی زندگی میں پائی جانے والی بے راہ رویوں اور بے اعتدالیوں کو اجاگر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں بالخصوص ادبی دنیا میں جو کج روی عام ہے اس کا ایسا جاندار نقشہ کھینچتے ہیں آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔

وزیر آغا اردو دنیا میں محقق، ناقد اور ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ خیال پارے کے نام سے شایع ہو چکا ہے جس میں بعض بے حد حسین انشایئے ہیں جو انگریزی انشائیوں کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں۔

نظیر صدیقی ہندو پاک میں ایک ناقد کی حیثیت سے مشہور ہیں تفہیم و تعبیر، اردو ادب کے مغربی دریچے، جدید اردو غزل ایک مطالعہ، غالب اور اقبال وغیرہ ان کی اہم تنقیدی تصانیف ہیں ان کے انشائیوں کا مجموعہ شہرت کی خاطر عرصہ ہوا شایع ہو چکا ہے وہ کم سے کم الفاظ میں نفس مطلب کو ادا کرتے ہیں اور سلیقۂ اظہار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، وہ رشید احمد صدیقی سے خاصے متأثر ہیں۔

آزادی کے بعد کے انشائیہ نگاروں کی فہرست یہیں تمام نہیں ہوتی اور بھی بہت سے نام ہیں اظہر مسعود صابر حسن رئیس، داؤد رہبر، حامد رشید ٹونکی، ممتاز شکیب، عزیز اللہ شیرانی، مشیر الدین صدیقی اور راشد ممتاز وغیرہ نے بھی اس صنف میں اپنی جولانی فکر کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں

مختصر یہ کہ آزادی کے بعد انشائیہ نگاروں نے اپنی تحریروں سے انشائیہ کے وزن و وقار میں نہ صرف اضافہ کیا ہے بلکہ انشائیہ کے فن میں پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لا کر مزاح کی وہ کیفیت پیدا کی ہے جس سے موجودہ عہد کا بے چین و بے قرار انسان صحت مند زندگی کے کچھ خوشگوار پل بھی گزار سکے

☆☆☆☆☆

حوالے:

(۱) زرگزشت مطبوعہ ادبی دنیا اردو بازار دہلی ۱۹۷۷ء ص ۸۹
(۲) زرگزشت مطبوعہ ادبی دنیا اردو بازار دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۰۷

(۳) زرگزشت مطبوعہ ادبی دنیا اردو بازار دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۱۱

(۴) شگفتگی دل کی خالد محمود موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲۰۰۳ء ص ۵۲،۵۳

(۵) شگفتگی دل کی خالد محمود موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲۰۰۳ء ص ۸۴،۸۵

(۶) انتخاب مضامین احمد جمال پاشا ص ۲۹

(۷) انتخاب مضامین احمد جمال پاشا ص ۶۵

(۸) پتوں پر چھڑکاؤ احمد جمال پاشا ص ۴۲

منشی دیبی پرشاد بشاش کا ’’تذکرہ شعرائے ہنود

ڈاکٹر ریحان حسن اسسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اردو و فارسی، گورونا نک دیو یونیورسیٹی

امرتسر (پنجاب)

اردو ادب میں تذکروں کی تاریخ بہت قدیم ہے جس سے ہمیں اپنی ادبی تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اگر تذکرہ نگاروں نے تذکرے رقم نہ کئے ہوتے تو نہ جانے کیسے کیسے ادیب اور شعراء گمنامی کے سمندر میں غرق آب ہو جاتے۔ عہد حاضر میں بھی قدیم شعراء کے حالات زندگی اور شاعری کے آہنگ سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہمیں تذکرہ نویسوں کے رقم کردہ تذکروں کی طرف ہی نگاہ کرنی پڑتی ہے انھیں تذکروں میں ایک اہم تذکرہ منشی دیبی پرشاد بشاش کا ’تذکرہ آثار الشعرائے ہنود‘ بھی ہے جو ۱۸۸۵ء میں رضوی پریس دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس تذکرہ کا پہلا حصہ ’معیار الشعراء ہنود‘ تھا جس میں غیر مسلم فارسی شعراء کا ذکر تھا لیکن افسوس کہ اس کا نسخہ فی الوقت دستیاب نہیں، راجستھان کے شعراء سے متعلق اس تذکرہ کے علاوہ احترام الدین شاغل کا تذکرہ ’تذکرہ شعرائے جے پور‘ وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے جس میں راجستھان کے ادباء اور شعراء کو خاطر خواہ جگہ دی گئی ہے لیکن منشی دیبی پرشاد بشاش کے اس تذکرہ کا شمار راجستھان کے اولین ادبی تذکروں میں ہوتا ہے جس سے ہمیں راجستھان کے ادبی دبستان کے بارے میں بعض ایسی معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ جس سے اس عہد کی شعری روایت کا اندازہ ہوتا ہے۔

منشی دیبی پرشاد بشاش نے اس تذکرہ میں حتی الامکان اس بات کی سعی کی ہے کہ ہندو شعراء کا ذکر چھوٹنے نہ پائے جیسا کہ ان کے اہتمام اور عزم بالجزم سے بھی ظاہر ہے۔ اس کے باوجود بعض شعراء کے حالات اور اشعار کتاب مکمل ہونے کے بعد دستیاب ہوئے اس لئے انھوں نے ایسے شعراء کے حالات کتاب کے ابتداء میں ہی ’یادداشت‘ کے عنوان سے درج کر دئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عموماً کتاب شائع ہونے کے بعد ہمارے ادبا اور محققین دوسرے علمی کاموں کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں وہ جس موضوع پر کام کر لیتے ہیں اس پر از سر نو وقت صرف نہیں کرتے لیکن منشی دیبی پرشاد کا شمار ان لوگوں میں ہے کہ کسی علمی موضوع پر کام کر لینے کے بعد بھی اس موضوع پر تحقیق و تلاش کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے ’تذکرہ آثار الشعراء ہنود‘ کے شائع ہونے کے بعد ہندو شعراء کے حالات اور اشعار کے تلاش کا عمل جاری رکھا اور اسی پر انھوں نے اکتفاء نہ کیا بلکہ انھوں نے لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے یہ باور کرایا کہ جن شعراء کے حالات کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اگر ان سے متعلق معلومات فراہم ہوتے ہیں تو طبع ثانی میں ان کے حالات اور اشعار بھی شامل کر دئے جائیں گے اور انھوں نے ایسا کیا بھی۔ دراصل منشی دیبی پرشاد کا یہ تذکرہ ۱۴۸ صفحات پر

مشتمل ہے کتاب کے مکمل ہونے کے بعد انھیں شعراء کے احوال وکلام جو حاصل ہوئے اس کو تو انھوں نے ضمیمہ آثار الشعراء ہنود کے نام سے کتاب میں شامل کیا کہ جو ۶ اصفحات پر محیط ہے اور اس کی فہرست ۶ صفحات پر نقل کی گئی ہے اس طرح یہ تذکرہ مجموعی طور پر ۷۰ اصفحات پر مشتمل ہے جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

بلبل شیراز پر اترا نہ اتنا گلستاں ہیں بلا کی طوطیان ہند بھی شیوا زباں
گو زبان فارسی شیریں مثال قند ہے پر جو ہندی میں نمک ریزی ہے وہ اس میں کہاں

مندرجہ بالا اشعار میں منشی دیبی پرشاد نے اردو زبان کی مقبولیت اور خصوصیت کی جانب خوبصورت انداز میں نشاندہی کی ہے۔ دراصل وہ اس تذکرہ سے قبل چونکہ ہندوؤں کی فارسی شاعری کا احوال 'معیار الشعراء ہنود' میں رقم کر چکے تھے اس لئے انھیں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ہندو اردو شعراء کے احوال و اشعار کو بھی یکجا کر دیا جائے تا کہ اہل علم کو اپنے علمی سرمایہ کا اندازہ ہو سکے چنانچہ انھوں نے اس تذکرہ میں ہندو شعراء کے احوال جمع کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ غیر معمولی ہے۔

تذکرہ آثار الشعراء ہنود میں ۱۵۸ شعراء اور ادباء کی سوانحی تفصیلات کے ساتھ ساتھ انتخاب کلام اور سنہ ولادت و وفات بھی رقم کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ صحت نامہ،فہرست شعراء،قطعات تاریخ اور ضمیمہ وغیرہ بھی درج ہیں۔انہوں نے تذکرہ میں یہ باور کرایا ہے کہ ہندوؤں میں سب سے پہلے اردو شاعر منشی ولی رام ولی ہیں جو شاہجہاں بادشاہ کے عہد کے نمائندہ شعراء میں تھے لیکن ہندو شعراء میں نند رام مخلص اور مہاراجہ رام نراین موزوں ان شعراء میں ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو وسعت دی۔اس کے علاوہ رائے سرب سکھ دیوانہ اور کاکا جی پروانہ نے بھی اردو شاعری میں اہم اضافہ کیا۔رائے سرب سکھ دیوانہ وہی شاعر ہیں جن کے شاگرد قلندر بخش جرأت نے اردو شاعری میں منفرد شناخت بنائی۔منشی دیبی پرشاد نے اس تذکرہ کے ذریعے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ ہندوؤں میں بے شمار ایسے شاعر ہیں کہ جن کی شاعری کو اہل ہنود کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی پسند کرتے ہیں اس ذیل میں انھوں نے جوہر، فرحت،وقار اور وہبی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔اہل ہنود میں اردو شعراء کے قلت کے اسباب کا ذکر وہ کچھ یوں کرتے ہیں:

'مسلمانوں کی بہ نسبت ہماری قوم میں عمدہ شاعروں کی تعداد کم ہے سبب اس کا یہ ہے کہ پچاس برس اول تو ہماری قوم کے لوگ معاش کی ضرورت سے اردو کی بہ نسبت فارسی کو زیادہ پسند کرتے تھے اور اب انگریزی بہت پسند کرتے ہیں پس اردو شاعری جس قدر ان پچاس برسوں میں ہم لوگوں کے اندر مروج ہوئی اگر کافی نہ تھی پر اس قدر تو ضرور تھی کہ پچاس برس اول میں جو مسلمانوں کا خیال ہندوؤں کی اردو شاعری اور زباں دانی کی نسبت تھا وہ اس سے بہت کچھ بدل گیا تھا یا تو ایک دن وہ تھا کہ انشاء اللہ خاں انشاء نے اپنی کتاب میں ہندوؤں کے کلام کو خالی از فصاحت لکھ دیا ایک دن ایسا آیا کہ مرزا غالب جیسے اوستاد مسلم الثبوت نے پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کو بلاغت کہا'

(منشی دیبی پرشاد،تذکرہ شعرائے ہنود،حصہ دوم،طبع رضوی پریس دہلی ۱۸۸۵ء صفحہ۲)

منشی دیبی پرشاد کے اس اقتباس سے ہندوشعراء کے عمدہ کلام نہ ہونے کے اسباب واضح ہیں اور جن شعراء نے اردوزبان و ادب کی طرف توجہ دی ان شعراء کی عطا کے اعتراف کا ثبوت بھی اس اقتباس میں موجود ہے۔لیکن ہندوشعراء کی قلت کے اسباب کا جوذکرانھوں نے کیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔جس وقت یہ تذکرہ شائع ہوااس وقت ہندوشعراء کی تعداد کے متعلق وہ مزید اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''اس مجموعہ میں پانسواکیس شاعروں کا کلام ہے گو قیاس چاہتا ہے کہ یہ تعداد باعتبار کثرت اور لیاقت علم وفضل ہندوؤں کے جو آج دیکھنے میں آتی ہے بہت کم ہے کیونکہ اس سے زیادہ تو اسوقت ہندوشاعر موجود ہوں گے لیکن جب صرف اسی قدر کی محنت تلاش اور دشواریابی پر خیال آتا ہے تو بے اختیار یہ شعر زبان حال سے نکل جاتا ہے۔

یوں لائے اس کے کوچے سے دل اپنا ڈھونڈھ کر　　دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

(منشی دیبی پرشاد،تذکرہ شعرائے ہنود،حصہ دوم،طبع رضوی پریس دہلی ۱۸۸۵ء صفحہ۲)

دیبی پرشاد بشاش کا یہ دعوی بلا دلیل نہیں بلکہ تذکرہ کے مطالعہ سے دلیل بھی فراہم ہوتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تذکرہ مکمل ہونے کے بعد جہاں بھی انھیں ہندوادیب کا سراغ ملا اس کے کلام واحوال کو دریافت کر کے تذکرہ میں شامل کر دیا۔انھوں نے اس تذکرہ شعرائے ہنود کا آغاز لالہ رگھبیر دیال کے حالات سے کچھ اس طرح کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''آثم تخلص لالہ رگھبیر دیال باشندہ متھرااور حال معلوم نہیں یہ شعراونکا ہے

گزر تیری طرح گلشن میں گر میرا صبا ہوتا　　گلوں پر پڑکے افسوں توڑ دیتے ہاتھہ گلچیں کے

(منشی دیبی پرشاد،تذکرہ شعرائے ہنود،حصہ دوم،طبع رضوی پریس دہلی ۱۸۸۵ء صفحہ۲)

اس تذکرہ میں ایسے شعراء کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جن کا نمونہ کلام درج نہیں لیکن احوال کا ذکر تذکرہ نگار نے اس لئے کر دیا ہے کہ کم ازکم شاعر کے حالات تو محفوظ ہو جائیں تا کہ بعد کے محققین کو کام کرنے میں آسانی ہواور آنے والی نسل اردو کے باکمال شعرا ء سے واقفیت حاصل کر سکے ایسے ہی شعراء میں ایک اہم نام کشن لعل مستؔ کا بھی ہے جن کا ذکر منشی دیبی پرشاد کچھ اس طرح کرتے ہیں:

'مستؔ تخلص کشن لعل قوم کایستھ ماتھر باشندہ دہلی تخمینا دس سال کا عرصہ ہوا کہ اونکا انتقال ہوگیا۔ذوق وغیرہ کے ہمعصر تھے اور بھا کا شعر بھی کہتے تھے مگر ہم کو کوئی کلام نہیں ملا۔'(منشی دیبی پرشاد،تذکرہ شعرائے ہنود،حصہ دوم،طبع رضوی پریس دہلی ۱۸۸۵ء)

تذکرہ شعرائے ہنود میں اکثر شعراء کا ذکر منشی دیبی پرشاد نے نہایت اختصار سے کیا ہے جب کہ تذکرہ میں بعض شعراء اور شاعرات کا ذکر تفصیل سے بھی ملتا ہے جن میں منشی بال مکند بے صبر، منشی رام سہائے تمنا، رائے جواہر سنگھ جوہر، منشی کیول رام ہوشیار، منشی رام سروپ شمیم، منشی دیبی دیال عابد، منشی کنہیالال عاشق، منشی شنکر دیال فرحت، منشی لعل چند گل چیں، منشی کالکا پرشاد موجد، منشی منسا رام ناتواں، منشی کامتا پرشاد ناداں، منشی دیپ چند حوشم، مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ، منشی دیا کرشن ریحان، منشی طوطا رام شایاں، منشی لالتا پرشاد شفق، پنڈت دیا شنکر نسیم، راجہ نول رائے وفا، راجہ کشن کمار وقار، منشی شیو پرشاد دیبی، جانکی بی بی صاحبہ اہل، مہاراجہ چنڈو لال شاداں وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ بالخصوص تذکرہ نویس منشی دیبی پرشاد نے اپنے والد محترم منشی تھن لال بہجت کا ذکر صفحہ ۲۳ سے صفحہ ۳۲ تک تقریباً دس صفحات میں احوال اور اشعار درج کئے ہیں یہی فراخدلی اگر انھوں نے دوسرے شعراء کے ساتھ بھی دکھائی ہوتی تو تذکرہ کی وقعت میں مزید اضافہ ہوتا۔ خود انھوں نے اپنے ذکر میں بھی اسی فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے اور عذر یہ پیش کیا ہے کہ اس تذکرہ میں اپنا ذکر کرنے سے گریز تھا لیکن دوستوں کے اصرار سے لاچار ہو کر اپنا احوال لکھا اور اپنی دلی خواہش کا یہ کہہ کر اظہار بھی کر دیا کہ 'تا کہ کلام یادگار ہو جائے' اس سے یہ ثابت ہے کہ تذکرہ نگار خود نمائی کے جذبے سے بھی سرشار ہے کہ جس کا ثبوت تذکرہ کے مطالعہ سے جابجا فراہم ہوتا ہے۔

منشی دیبی پرشاد کا اپنی شاعری کی ابتدا کے متعلق یہ کہنا ہے کہ صاحب زادہ محمد خاں صاحب ٹونک سے جب اجمیر آئے تو وہ انھیں مشاعرے میں لے گئے مشاعرہ میں طرح تھی 'کچھ بھی بن آتی نہیں کیا کیجئے' اس پر انھوں نے غزل کہی جو حاضرین جلسہ کو بھی پسند آئی جس ہمت افزائی کے صلے میں ان میں میدان شاعری میں قدم بڑھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ صاحب زادہ صاحب نے ان کا تخلص حریق تجویز کیا جب کہ ان کے والد محترم تھن لال بہجت نے تخلص بشاش رکھا جسے متبرک سمجھ کر انھوں نے دونوں ہی تخلص بحال رہنے دیا۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو

دیکھ کر اس ترک کو کلمہ لگا پڑھنی حریق ایک ہندو تھا یہاں وہ بھی مسلمان ہو گیا

(منشی دیبی پرشاد، تذکرہ شعرائے ہنود، حصہ دوم، طبع رضوی پریس دہلی ۱۸۸۵ء صفحہ ۱۷)

تذکرہ شعرائے ہنود میں اپنے احوال کی تفصیل کے علاوہ صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۲۰ تک تقریباً پانچ صفحات میں اردو شاعری کی بیشتر اصناف میں صدہا اشعار اپنے نقل کر دئے ہیں اگر وہ دیگر شعراء کے بھی اشعار اسی طرح نقل کر دیتے تو اس عہد کے بہت سے گمنام شعراء کی سخندانی سے ہمیں مزید آگاہی ہوتی۔ تذکرہ کے اختتام میں ''ضمیمہ آثار الشعراء ہنود'' کے نام سے ۱۶ صفحات پر شعراء کا تذکرہ جس قبیل سے کیا گیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے کیونکہ ان میں بیشتر ایسے شعراء ہیں کہ جن کا کلام و احوال اس عہد میں بھی حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ دراصل اس ضمیمہ میں انھوں نے ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جو کتاب کے مکمل ہونے کے بعد دستیاب

ہوئے تھےلیکن بیشتر شعراءکا ذکرنہایت اختصار سے ہے جیسا کہ پورےتذکرہ میں ان کی یہی روش نظرآتی ہےجیسا کہ وہ کہن لال آرام کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

’’آرام تخلص کہن لال قوم کایستھ باشندۂ دہلی ایک مرد زکی ہیں اور یہ شعر اونکی افکار نادر سے ہے

ہمدمو مجھ سے یہ کہتے ہو نہ تو یار سے مل اوسکو سمجھاؤ ذرا یہ کہ نہ اغیار سے مل

(منشی دیبی پرشاد،تذکرہ شعرائے ہنود،حصہ دوم،طبع رضوی پریس دہلی ۱۸۸۵ء)

مختصر یہ کہ منشی دیبی پرشاد نے بعض شعراء کے احوال واشعار درج کرنے میں جس قدر اختصار سے کام لیا ہے اس سے قاری کو ہرموقع پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ تذکرہ میں چند تسامحات بھی ہیں خود تذکرہ کے نام’ آثارالشعراء ہنود‘ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ان شعراء کا ذکر ہے جنہوں نے ہنود پر شاعری کی ہو جب کہ اردوادب میں ’ہنود‘ شاعری کی کوئی صنف نہیں اردوزبان میں شعرائے غزل،شعرائے نظم اور شعرائے مرثیہ تو کہا جا سکتا ہے شعرائے ہنود کہنا میری نظر قاصر میں مناسب نہیں اس لئے کہ اس تفریق سے زبان کو مذہب میں تقسیم کرنے کی فکر کوتقویت ملتی ہے جب کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔بہرنوع ہندوادباء اور شعراء سے متعلق علامہ دتاتریہ کیفی،خواجہ عشرتی لکھنوی وغیرہ نے بھی تذکرے لکھے ہیں لیکن اس تذکرہ کو اس حوالے سے تمام تذکروں میں اولیت حاصل ہے اس لئے تحقیقی نقطہ نظر سے چند تسامحات کا درآنا قابل گرفت نہیں۔البتہ تذکرہ کی اہمیت اس اعتبار سے اہم ہے کہ راجستھان کے ادباء اور شعراء سے متعلق یہ ایسا تذکرہ ہے کہ جس سے نہ جانے کتنے ہی تذکرہ نویسوں نے اس ایک چراغ سے کئی چراغ روشن کئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

چاند بہاری لال صبا جے پوری۔ایک مطالعہ

ڈاکٹر سید محمد ارشد رضوی،اسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو

گورنمنٹ رضا پی جی کالج رام پوراتر پردیش

شعرائے راجستھان میں منشی چاند بہاری لال صبا کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے،صبا انتہائی خلیق اور باوضع شخصیت کے مالک تھے۔مزاج میں ظرافت اور شوخی بھی پائی جاتی تھی ساتھ ہی خوددار طبیعت کے مالک تھے،ان کا یہ شعران کی وضع داری اور شوخی دونوں کا غماز ہے کہ

کچھ بھی چلی نہ میرے انقلاب　　　میں نے تو ایک وضع پہ اپنی گزار دی

صبا ۲۵ردسمبر ۱۸۹۵ءکو جے پور میں پیدا ہوئے۔اس لئے شعرائے جے پور میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں ان کا تعلق جے پور کے ایک مشہور گھرانے سے تھا وہ شہنشاہ جہاں گیر کے نائب وزیر رائے مکند کی اولادوں میں ہیں۔ان کے جداعلیٰ منشی نندکشور مہاراجہ سوائی رام سنگھ کے میر منشی تھے اور جے پور کی نہایت مقتدر شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا صبا کے والد منشی گوبندنرائن فارسی کے بڑے عالموں میں تھے ان کی تصنیف انشائے گوبندنرائن فارسی زبان میں شائع ہو چکی ہے

صبا کی تعلیم وتربیت رئیس زادوں کی طرز پر گھر پر ہوئی،مصنف تذکرہ خمخانۂ جاوید لالہ سری رام اور تذکرہ شعرائے جے پور کے مطابق انہوں نے پہلی غزل ۱۹۱۴ء میں کہی۔صبا مرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔شعروسخن سے قلبی لگاؤ تھا ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کے کلام کے وسیع مطالعے نے بھی صبا کی شعری صلاحیتوں میں صیقل کا کام کیا مسلسل مشق سخن اور مائل دہلوی کے فیض نے صبا کی شاعری میں چار چاند لگادیئے۔صبا مرزا مائل دہلوی کے جانشین بھی ہوئے۔مائل دہلوی کے انتقال پر ان کے شاگردوں نے مولانا کوثر کو جانشین مقرر کرنا چاہا لیکن مولانا کوثر نے صبا کا نام تجویز کر کے اس بات پر مہر لگادی کہ صبا ہی جانشینی کے حقیقی مستحق ہیں بقول مصنف شعرائے جے پور ان کی جانشینی کو لکھنو اور دہلی کے اساتذہ نے بھی مسرت کے ساتھ تسلیم کیا۔

صبا نے جس عہد میں شعروسخن کے میدان میں قدم رکھا،ہندوستان کی تاریخ میں وہ دور انقلاب کا دور تھا لیکن صبا کے یہاں غزل کا کلاسیکی رنگ ملتا ہے۔انقلاب کی آواز ان کے یہاں سنائی نہیں دیتی،ان کے شعری مجموعے میں کچھ قومی وملکی نظمیں ملتی ہیں لیکن ان کی حیثیت جزوی ہے۔انہوں نے اپنے استاد کی شاعرانہ خصوصیات کو قائم رکھنے کی بھرپور سعی کی ہے۔زبان بامحاورہ استعمال کی ہے،تشبیہات واستعارات کے استعمال میں جدت کا احساس ہوتا ہے۔الفاظ کے خلاقانہ استعمال پر بھرپور قدرت حاصل

تھی ۔ وہ عام اور سادہ مضامین کو بھی دل کشی بخشنے کا ہنر جانتے تھے ۔غزل میں طرز قدیم کے پیرو تھے،ان کے کلام میں آمد کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔سہل ممتنع ان کے کلام کا خاصہ ہے۔خمریات کے میدان میں بھی خوب زور دکھایا ہے وہ کہتے ہیں کہ

یہ التجا ہے ساقیٔ کوثر سے اے صبا　　میخانۂ کہن میں شرابِ کہن رہے

رسمِ زمانہ کے مطابق صباؔ نے بھی اپنے کلام کی ابتداءنعت گوئی سے کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ

تصور باندھ کر دل میں تمہارا یا رسول اللہ　　خدا کا کرلیا ہم نے نظارہ یا رسول اللہ

بھروسہ اس کو کہتے ہیں گنہگاروں نے محشر میں　　خدا کے سامنے تم کو پکارا یا رسول اللہ

اور نعت کا یہ شعر اپنے اندر انتہائی ندرت اور مزاج کی شوخی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔نعت میں شوخی کا امتزاج کسی ماہرفن کو ہی میسر ہوسکتا ہے

کلیم اللہ آتے بھی تو کیوں آتے مدینے میں　　انہیں کیا ہوش کھونے تھے دوبارا یا رسول اللہ

کلاسیکی اور روایتی غزل میں صباؔ نے ہرطرح کے مضامین کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔نازک خیالی اور تخئیل کی پرواز بلند ہے ہرجگہ لفظ ومعنی کے حسین سنگم کا احساس ہوتا ہے ملاحظہ ہوں ان کے کلام سے چند اشعار

یہی ہے جو تنہا نشینی میں قوت　　تیری یاد کو بھی بھلانا پڑے گا

نہ آئیں وہ دل میں مگر نام بن کر　　زباں پر تو عاشق کی آنا پڑے گا

وہ ہوں کشتۂ لن ترانی کہ میری　　جہاں قبر کھودی وہاں طور نکلا

لبوں تک آتے آتے ہی جو بے تاثیر ہوجائے　　وہ نالہ تو کسی درد آشنا کا ہونہیں سکتا

یہ ایسا راز ہے جس کو فقط عاشق سمجھتے ہیں　　جو ان کا ہونہیں سکتا خدا کا ہونہیں سکتا

صباؔ کے کلام میں شوخی کا انداز بھی دیکھئے

گنہگاروں کو کیا شیخ بخشوائیں گے　　حلال جن سے کہ جام شراب ہو نہ سکا

سب ترے حسن کے نیرنگ ہیں کہنے کو کہیں　　شمع نے آگ لگا رکھی ہے پروانوں میں

نہ پوچھو درد مندوں کی دعا کی　　بدل دیتی ہے وہ مرضی خدا کی

رہا ثابت مرا جب تک گریباں　　مری دیوانگی مجھ پر ہنسا کی

مجھے عاصی نہ کہنا روزِ محشر　　اگر ڈھونڈھے نہ خود رحمت خدا کی

جو سمجھ سے ہر اک کی باہر ہے　　ہم اسی کو خدا سمجھتے ہیں

نیرنگ زمانہ، بے ثباتی دنیا، اخلاقی قدروں کا زوال اور زندگی کے آزار جیسے مضامین صباؔ نے بڑی چابکدستی کے ساتھ باندھے ہیں ملاحظہ ہوں چند اشعار

اور ہے اب رنگ دنیا وہ زمانہ اب کہاں
خوش ہوا کرتے تھے جن انساں کو ۔۔۔

موت آجائے جو اس وقت غنیمت جانو
آج کل زیست سے بڑھ کر کوئی آزار نہیں

انسان وہ بلا ہے خدا جانے کیا کرے
کچھ بھی جو زندگی پہ اسے اعتبار ۔۔۔۔

ادھر اس کو بنا ڈالا اُدھر اس کو مٹا ڈالا
تھے کچھ اور بھی اے گردش ایام ۔۔۔۔

جہاں کا رنگ کیا دیکھوں کہ میں نے دیکھ رکھا ہے
بہت کچھ ملتا جلتا ہے مرے ۔۔۔۔۔

جے پور میں ایسا کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا تھا کہ جس میں صباؔ کی شرکت نہ ہوتی ہو۔ مقامی اور اکثر بیرونی مشاعروں میں انہیں صدارت کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔

۱۹۲۹ء میں ان کو آل انڈیا کایستھ کانفرنس دہلی کے آل انڈیا مشاعرے میں سب سے بہترین غزل پیش کرنے پر طلائی تمغے سے نوازا گیا۔

صباؔ بہ حیثیت شاعر اپنے استاد مرزا مائلؔ دہلوی کی خصوصیات کو اپنے کلام میں قائم رکھتے ہیں اور اسی شاہراہِ استاد کی اتباع میں غزلوں پر ہی زورِ طبیعت صرف کیا ہے۔

اردو کے لئے ان کی خدمات فقط شعر وسخن تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہوں نے انجمن ترقی اردو جے پور شاخ کے نائب صدر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ ساہتیہ اکیڈمی راجستھان میں اردو کے نمائندہ رکن کی حیثیت سے بھی کام کیا، ساتھ ہی پبلک لائبریری جے پور کی ورکنگ کمیٹی میں بھی اردو کی نمائندگی کی۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۹/اپریل ۱۹۶۹ء کو جے پور میں جشنِ صباؔ کے عنوان سے ایک ادبی تقریب کا انعقاد ہوا جس میں صباؔ کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی نیز دو روزہ آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا گیا اور اس مشاعرے میں ان کے کلام کا ایک انتخاب جشنِ صباؔ کمیٹی نے شائع کیا اور دس ہزار روپئے کا نذرانہ بھی ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان کا دیوان ساہتیہ اکیڈمی راجستھان نے دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا اور تاحیات ڈھائی سو روپئے ماہوار وظیفہ کا اعلان کیا۔

اس طرح راجستھان کے غیر مسلم شعراء میں چاند بہاری لال صباؔ کا نام ہمیشہ ادب واحترام سے لیا جائے گا

☆☆☆☆☆

بیکانیر میں اردوادب کے لیے غیرمسلم حضرات کی خدمات

ڈاکٹرشکیلہ بانو اسسٹنٹ پروفیسر

بی جے ایس رامپوریا جین کالج، بیکانیر

بیکانیرشہر کی بنیاد جودھپور ریاست کے راج کماراور بیکانیر ریاست کے بنیادگزار راؤبیکا نے ۱۴۸۸ء میں رکھی۔ یہ ریاست راجپوتانہ کی اہم اور بڑی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ یہ ریاست جہاں شمشیروسناں کے حوالے سے اپنی شاندار تاریخ رکھتی ہے وہیں تہذیب وثقافت اورعلوم وفنون کے لحاظ سے بھی کسی دوسری ریاست سے پیچھے نہیں رہی۔ ہندوستان میں جس گنگا جمنی تہذیب کی بات کی جاتی ہے اس کی سب سے اچھی مثال اسی شہر میں ملتی ہے۔اس تہذیبی اشتراک کا سلسلہ ابتدا ہی سے شروع ہوگیا تھا۔مغلیہ سلطنت سے گہرے روابط کے سبب یہاں تہذیب وثقافت اورعلوم فنون پر بھی مغلیہ دربار اوران کی تہذیبی زندگی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اس سلسلے میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے داکٹر ابوالفیض عثمانی لکھتے ہیں۔

’اس کی پانچویں پشت میں راجہ کلیان مل (۱۵۴۸ء تا ۱۵۷۳ء) نے اکبراعظم کی اطاعت قبول کر کے اپنے بھائی کان سنگھ کی دختر کواس کے عقد میں دیا تھا۔اس قرابت کے باعث سلاطین مغلیہ نے والیان بیکانیر کواعلی خطابات اورمعزز القابات سے نوازا یہ سلسلہ احمد شاہ کے عہد تک جاری رہااوراحمد شاہ اس ریاست کے چودھویں فرماں رواں راجہ گنج سنگھ (۱۷۴۶ء تا ۱۷۸۸ء) کوہفت ہزاری منصب اورراج راجیشور مہاراج دھراج مہاراجہ سرومنی گنج سنگھ بہادر‘ کا خطاب عطا کیا تھا۔انھیں تعلقات کی بناپر بیکانیر میں فارسی کارواج پانا ایک فطری امر تھا۔

ریاست کے سترہویں حکمراں مہاراجہ صورت سنگھ (۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۹ء) نے ۱۸۲۰ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے سلاطین مغلیہ سے تعلقات ختم کردیے۔مگر ریاست کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ [۱]

انیسویں حکمراں مہاراجہ سردارسنگھ (۱۸۵۲ء تا ۱۸۷۲ء) نے مرزاغالبؔ سے ریاست کے سکہ پر کندہ کرنے کے لیے ’سکہ‘ لکھنے کی فرمائش کی تھی اورمرزاغالبؔ نے تین شعر لکھ کر مہاراجہ کو بھیجے تھے۔مہاراجہ مذکور کی جانب سے ملکہ وکٹوریہ کے نام فارسی میں ایک مکتوب کا مسودہ بھی مرزاغالبؔ نے حسب الطلب روانہ کیا تھا جس کا ذکر غالبؔ کے مکتوب تاریخی ۵/جنوری ۱۸۵۹ء میں موجود ہے۔۔۔[۲]

مہاراجہ ڈونگرسنگھ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے خود بھی اردو پڑھی تھی اورریاست کے سرکاری مدارس میں بھی فارسی اردو

تعلیم کا انتظام کیا تھا۔اس کے بعد میں مہاراجہ گنگا سنگھ ۱۸۸۷ء میں تخت نشین ہوااوراس کے عہد میں بیکانیر کے سرکاری دفاتر میں بھی اردو کا استعمال ہونے لگا اوراس طرح اردوداں حضرات ریاست کے مختلف محکموں میں ملازم ہوئے۔' ۳

بیکانیر میں دوسری ریاستوں کی طرح مغلیہ سلطنت کے اثرات یہاں کی تہذیب وثقافت اورزبان وادب پرخوب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان اگرچہ راجستھانی تھی لیکن مغلیہ سلطنت سے رابطہ بنائے رکھنے کے لیے فارسی زبان کا استعمال بھی ہوتا تھا۔اس لیے مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی فارسی زبان کی اہمیت بھی کم ہوتی گئی اورایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی جگہ انگریزی کوسرکاری زبان قراردے دیااوردفاتر میں اردوکوبھی رائج کردیا۔مختلف دیسی ریاستوں میں فارسی اوراردو جاننے والوں کی ضرورت بنی رہتی تھی۔ان ریاستوں نے اپنے مدارس میں فارسی اوراردو کی تعلیم کوضروری قراردیا۔بغیر تفریقِ مذہب وملّت ،اردواور فارسی کی تعلیم عام تھی۔اس لیے ان دونوں زبانوں میں ہندویامسلمان یاسکھ یاکوئی اوراپنا علمی اظہارکرتے تھے۔دفاتر کے کام کے علاوہ دیگر علمی کاموں میں بھی انھیں زبانوں کوذریعہ اظہار بنایا جاتا تھا۔شروع میں فارسی کواہمیت حاصل رہی لیکن رفتہ رفتہ اس کی جگہ اردو نے لے لی۔یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ تخلیقی اورتحریری کام ہوتا نظرآتا ہے۔بیکانیر ریاست میں ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جنھیں اردووفارسی پرمہارت حاصل تھی ان میں مسلمان بھی تھے اورغیر مسلم بھی۔چونکہ انیسویں صدی میں دفاتر کی زبان اردوتھی اس لیے یہاں کی تاریخ اوردیگر ریاستی رپورٹ وغیرہ اردو میں تیارکروائی گئیں۔

چنانچہ اسی زمانے میں ریاستِ بیکانیر کے محکمہ ایجنیسی کونسل کے ایڈیشنل ممبر کے عہدے پرمنشی سوہن لال بھٹنا گر فائز ہوئے۔منشی سوہن لال بھٹنا گر نے'تاریخ راجیہ بیکانیر' کے نام سے'ریاستِ بیکانیر کی تاریخ' مرتب کی جو ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔یہ کتاب ۱۸۹۰ء میں جیل پریس بیکانیر میں چھپی تھی۔اس میں ریاست کے جغرافیائی حالات ریاستی نظم ونسق کے علاوہ رفتارِتعلیم پربھی روشنی پڑتی ہے۔۴

اسی طرح رائے بہادرسوڈھی حکم سنگھ اسسٹنٹ کمشنر پنجاب وائس پریزیڈینٹ ایجنیسی کونسل راجسری بیکانیر نے'بیکانیر کا جغرافیہ'اور 'سوانح عمری رؤسا وشرفائے بیکانیر' کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔سوانح عمری'رؤسا وشرفائے بیکانیر' کی پہلی جلد ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب کے بارے میں سوڈھی صاحب لکھتے ہیں:

''جوواقعات اس کتاب میں لکھے گئے ہیں وہ عموماً یا تو کاغذات بیکانیر سے اخذ کیئے گئے ہیں یا جغرافیہ بیکانیر وگائیڈ ٹو بیکانیر مرتبہ مصنف سے اخذ کیے گئے ہیں۔اورحتی الامکان ان معتبر لوگوں سے دریافت کرکے لکھے گئے ہیں جن کوان سے پوری واقفیت تھی۔۔۔۔یہ کتاب تین جلدوں پرمنقسم کی گئی ہے جن میں سے یہ جلداول مکمل ہوکرچھپ چکی ہے،اور باقی جلدیں چھپ رہی ہیں''۔۵

یہ کتاب حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔یعنی یہ ایک تذکرہ ہے۔اس میں کل ۱۹۸ صفحات ہیں۔جغرافیہ بیکانیر اردو میں لکھی گئی تھی جو نایاب ہے،البتہ اس کا انگریزی ترجمہ دستیاب ہے۔ایک بہت ضخیم کتاب 'تاریخ ریاستِ بیکانیر' کے نام سے لکھی گئی۔ جسے ٹھاکر میگھ سنگھ نے تصنیف کیا۔ یہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی۔

تاریخِ راجیہ بیکانیر اور دیگر کتابوں پر لکھے گئے تاریخی قطعات سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو شاعری کرتے تھے۔ان میں سے چند نام یہ ہیں:

۱۔منشی شنکر سوروپ نجات

۲۔منشی جے سکھ لال

۳۔منشی جے رام پرشاد تشنہ

۴۔منشی بندیش پرشاد

ملازمت کے سلسلے میں یہاں کچھ ایسے یوروپین اور انڈو یوروپین حضرات بھی آئے جو شاعری کے دل دادہ تھے۔ان میں کپتان ڈومنگو پال ذرّہ اور لوئیس پیٹرک لیزوا توقیر شامل ہیں۔کپتان ڈومنگو پال ذرّہ مہاراجہ سردار سنگھ کے عہد میں بیکانیر پہنچے اور افسر جیل ومیونسپلٹی اور فوج کے کپتان تھے۔پھر وہ جے پور چلے گئے جہاں ۱۹۰۹ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ان کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

Captain DP Lajole has the distinction of leaving a complete dewan in Urdu . His poetical master was one Yakta of Lucknow to whom he refers frequently in the concluding lines of his ghazals .The dewan contains 140 ghazals, ancluding three sahras, one poem on holi and a poem with a chrono gram on the death of Khan Bahadur Dewan Amin Mohammad Sahaab, Dewan, Bikaner Raj. (1888) The ghazals are in every radif . His son the late Mr LP. Lajole, MBe, wrote to me that besides the Dewan he had had other poems of his Father in his possession which now, however , seem to be lost . it is said that inlater years he also consulted shore saheb in poetry.6

ذرّہ کا نمونہ کلام دیکھئے

ہم عاشقوں کو خاک نشینی پسند ہے وہ شاہِ اوج حسنِ تجمّل سے مُبتلا
اقرار شام سے ہے بڑھا روز حشر پر کیوں دل ہوا ایسے اہلِ تغافل سے مبتلا

لوئیس پٹرک لیزوا توقیرؔ کا ذکر بھی ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب European and Indo- European Poets of Urdu and persian میں کیا ہے۔لوئس پیٹرک لیزوا توقیرؔ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔تعلیم سے فارغ ہوکر ریاست بیکانیر میں ہیڈ کلرکی سے ملازمت شروع کی اور ترقی کر کے ایڈیشنل ریو ینیو منسٹر کے عہدے تک پہنچے۔(M.B.E.) کا خطاب بھی حاصل کیا۔۲۲؍اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

گالیاں کھانا خون دل پینا ذائقے ہیں یہ دل لگانے کے
وہ اپنی بزم میں غیروں کے خوف سے توقیرؔ ہماری سمت کرم کی نگاہ کر نہ سکے

بیسویں صدی میں شعروادب کا ذوق پروان چڑھا اور یہاں ادبی سرگرمیاں ہونے لگی باہر سے آنے والوں کے علاوہ مقامی شعرا بھی سامنے آئے جن میں بیدلؔ بیکانیری، راسخؔ بیکانیری اوران کے بعد کی نسل سے تعلق رکھنے والوں میں عثمان عارفؔ، غازیؔ بیکانیری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔۱۹۴۷ء کے بعد کئی ایسے غیر مسلم حضرات یہاں تشریف لائے جواردو سے واقفیت رکھتے تھے اوران میں سے کچھ ادیب بھی تھے ان میں کامیشور دیال حزیںؔ، ہردرشن سنگھ سہگل، مدن کیولیہ، دیوانؔ چند دیواں پریم کمار سنگھ پریمؔ، ملاپ چند راہیؔ اور ساحلؔ دہلوی کے نام سامنے آتے ہیں۔

کامیشور دیال حزیںؔ ۲۳ فروری ۱۹۱۵ء کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔۱۹۴۰ء سے قبل آپ بیکانیر میں ملازم ہوئے اور جس وقت بیکانیر تشریف لائے اس وقت اردو میں افسانے لکھا کرتے تھے،مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے افسانے شائع بھی ہوئے۔ یہ سلسلہ بیکانیر آنے کے بعد بھی جاری رہا لیکن بعد کو وہ شاعری کی طرف آ گئے ۔اب تک ان کے کلام کے مجموعے’ دلِ حزیں‘اور’بعد جانے کے تمھارے‘(دیوان حزیں) کے نام سے منظرِ عام پرآ چکے ہیں۔انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے بھی کیا تھا۔غزل گوئی سے انھیں خاص شغف تھا۔بہت پراثر شعر کہتے تھے۔ان کے بارے میں جناب عثمان عارف صاحب فرماتے ہیں

’شعرائے بیکانیر میں جن شاعروں کو قبولِ خاص و عام کا درجہ حاصل ہے اور جن کے نام اور مقام ’’تاریخ شعر وسخن‘‘ میں قائم اور محفوظ رہیں گے ان میں جنابِ حزیں کا ذکر بڑے وثوق اور اعتماد سے کیا جا سکتا ہے۔۔حزیں صاحب کے کلام کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ میر کی زبان میں ’پراگندہ طبع لوگ یا بہ زبانِ مولانا روم عشقِ خوش سودا کے دل و داد و رفتہ اپنی اپنی نشستوں اور محفلوں میں آہیں بھر بھر کر دہراتے ہیں۔وجہہ وہی درد و محبت کی کرشمہ سازی، حسن فتنہ ساماں کی جادوگری۔دراصل حزیں کی شاعری نگاہوں کے تادم سے نہیں دلوں کے ٹکراو سے پیدا ہوئی ہے۔‘۸

جہاں ایک طرف حزیںؔ جذبہ عشق کی مختلف کیفیات کا بیان کرتے ہیں وہیں ان کے کلام میں زندگی کے حقائق کا گہرا شعور بھی نظر آتا ہے۔چند شعر دیکھئے:

تری نیچی نگاہیں جن کو اٹھنا تک نہیں آتا
انھیں کو ہم نے دیتے موت کا پیغام دیکھا ہے

وہیں موجیں رواں ہیں جن میں کشتی زندگانی کی
نہ راس آئے تو طوفاں ہیں جو راس آئے تو ساحل ہیں

عشق کی راہوں میں پروانہ ہی رہبر ہے حزیںؔ
اپنی آنکھوں سے لگا لے خاک ہر پروانہ ہم

میں تشنہ کام لوٹا ہوں دونوں مقام سے
کعبے میں اور دہر میں ملّت کی قید ہے

دیوان چند دیوانؔ کی پیدائش ۱۳/نومبر ۱۹۳۳ء کو ٹانک ضلع ڈیرا اسماعیل خاں میں ہوئی۔ان کے والد کا نام ٹکا رام تھا۔ دیوانؔ نے بیکانیر کے مشہور شاعر مستانؔ بیکانیری کی نظم پڑھی جو کہ ایک بھیانک حادثے پر لکھی ہوئی تھی جس کو پڑھ کر دیوانؔ بہت ہی متاثر ہوئے اس نظم نے دیوانؔ کے اندر سوئے ہوئے شاعر کو جگایا اور اس طرح دیوانؔ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر کے آنے والے قافلے کے ساتھ ہندوستان آئے اور بیکانیر میں بس گئے۔ان کی تعلیم اردو میں ہوئی تھی اس لئے بچپن ہی سے انہیں اردو سے خاص لگاؤ تھا۔انھوں نے تقسیم کے فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔جس میں ان کا سب کچھ جل کر خاک ہو گیا تھا۔دیوانؔ کا سب کچھ لٹ چکا تھا جو بچا کے لا سکے تھے وہ ان کی اردو زبان تھی۔جس میں ان کی یادیں چھپی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جن حالات سے ان کا واسطہ پڑا اس نے ان کو تنگ نظری کا شکار نہ ہونے دیا۔انہوں نے اپنے ذہن کو صاف رکھا اور محبت، اخوت اور مذہبی رواداری کو اپنا شعار بنائے رکھا۔انہوں نے جہاں غزلیں لکھی ہیں وہیں نعت، سلام اور منقبت بھی لکھی ہیں۔جناب دیوان چند دیوانؔ تقریباً چالیس سال تک مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ان کی دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ا۔پروازِ شاہین (’حمد و نعت کا مجموعہ)۲۔حسنِ ادب (غزلیات اور قطعات کا مجموعہ) دیوان چند دیوانؔ غزل کے ساتھ

حمد،نعت،سلام اور منقبت بھی بڑی عقیدت کے ساتھ کہتے تھے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

حمد:

غیر ممکن ہے تری تعریف ہو مجھ سے بیاں — میں ہوں عاجز اور تو ہے مالکِ ہر دو جہاں

نعت کے یہ اشعار دیکھیں

کیا خوف اس کو روزِ قیامت کی دھوپ سے — دیواںؔ ہے زیرِ سایۂ دامانِ مصطفیٰ

انوارِ حق برستے ہیں دن رات اس جگہ — جنّت سے کم نہیں ہے گلستانِ مصطفیٰ

دوا کیا کارگر ہوگی میں بیمارِ محمد ہوں — طبیبو نام لو ان کا تو میری جاں میں جاں آئے

گونجتی تھی زمانے میں جو آوازِ بلالی — اب تک وہی آواز فضاؤں میں بسی ہے

دیوان نے سلام بھی بڑی عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں

دیواں بھی حُسینی ہے مناتا ہے یہ ماتم — عاشورِ میں اس کو کبھی خنداں نہیں دیکھا

اپنے لہو سے سینچ کے اس ریگ زار کو — شبیر کربلا کو گلستاں بنا گئے

پھر سے کسی حُسین کی آمد ضرور ہے — لو وقت کے یزید پھر اپنی پہ آگئے

مناقب کے میدان میں بھی دیوان نے اپنی عقیدت کا اظہار بہت پر اثر انداز میں کیا ہے۔حضرتِ صِدیقِ اکبر کی شان میں منقبت کا یہ شعر ملاحظہ ہو

قرینے سے سجا دیواںؔ یہ نظرانہ عقیدت کا — سنا ہے خاص نسبت ہے تجھے صدیقِ اکبر سے

اردو زبان سے ان کو بے انتہا محبت تھی جس کا ثبوت ان کا یہ شعر ہے

کیا حسیں ہیں یہ اردو زباں دوستوں — اس کا عاشق ہے سارا جہاں دوستوں

دیوان چند کی غزلیہ شاعری میں ماضی کا درد شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے ملاحظہ کریں

آشیانہ جلے ایک مدت ہوئی — دل سے اٹھتا ہے اب تک دھواں دوستوں

مگر اسی کے ساتھ ان کے یہاں غزل کا کلاسکی لہجہ بھی پایا جاتا ہے۔مثلاً

یہ زلفِ سیہ اور تیرا روئے مُنوّر — میں ایک جگہ شام و سحر دیکھ رہا ہوں

تیری زلفوں کے سائے میں اندھری رات دیکھی ہے

سلامت تیری رعنائی ہم اپنے ہوش کھو بیٹھے

پریم سنگھ ۲۱ راکتوبر ۱۹۱۳ء کو خان پور ریاست بھاول پور میں پیدا ہوئے ،ان کے والد دیوی دیال ایڈوکیٹ فارسی و اردو کے اچھے عالم تھے۔ ۵ رجنوری ۱۹۴۷ء میں آپ کو خانپور چھوڑنا پڑااور ایک شرنارتھی کی حیثیت سے ہندوستان آئے ۔ پریم نے بی۔ اے، بی۔ ٹی کیا اور فارسی و اردو میں آنرس کی ڈگریاں بھی حاصل کیں ۔آپ اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن راجستھان کے عہدے پر فائز رہے۔شعروسخن سے فطری ذوق تھا۔تقسیم کے وقت اپنا گھر ، جاگیر اور ملازمت چھوڑ کر بیکانیر آ گئے ۔ پریم کا شعری مجموعہ 'بہت دور جانا ہے تجھ کو مسافر'۲۰۰۱ء میں ان کے انتقال کے بعد منظرعام پر آیا جسے ڈاکٹر محمد حسین نے ترتیب دیا۔اس مجموعہ میں قطعات ورُباعیات اور غزلیات ومنظومات شامل ہیں ۔ان کی شاعری میں روحانیت اور رومانیت پائی جاتی ہے ۔ پریم خودداری اور زندہ دلی کے شاعر ہیں ۔وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں ان لوگوں کی تعریف کرتے ہیں جو ہمت کے بل پر زندہ رہتے ہیں ۔سہاروں کے بھروسے پر نہیں ۔مسافر کا مقصد صرف اور صرف منزل تک پہنچنا ہوتا ہے چاہے اس پر کتنی ہی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں وہ قسمت کے بھروسے نہیں رہتے بلکہ قسمت کو بدلنا بھی جانتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یوں ہی ہوتا رہیگا شکوۂ دورِ زماں کب تک نہیں بدلا زمانہ تو ، بدل دو تم زمانے کو
کرن پھوٹی، سحر کا پھر نیا پیغام آتا ہے یہ دورِ شام بھی ہے دو گھڑی کا میہماں اب تو

پریم سنگھ اجالوں کے طلب گار تھے ۔وہ اندھیروں سے ڈر کر اپنا راستہ نہیں بھٹکنا چاہتے تھے انہیں بھروسہ تھا کہ اندھیرا مٹے گا اور اجالے پھیلے گا۔ان کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

روشنی سے ہم نہیں محروم رہ سکتے سدا بڑھ رہا ہے سایۂ تاریکیِ باطل تو کیا

پریم کی غزلوں میں انسانیت سے محبت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے ۔وہ انسان کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ایسی عبارت سے کوئی مطلب نہیں جس میں خدا کو تو خوش کیا جاتا ہے لیکن اس کے بندوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔اس لیے وہ اپنی غزل میں کہتے ہیں کہ

ہاں پریم کا تو مذہب ہی نہیں مومن وہ نہیں ہو سکتا مگر
بھگوان کے بھکتوں میں نہیں، ہے پیارا سے انسانوں سے

دوشعر اور دیکھیں:

رنج و غم کے خریدار ابھی باقی ہے بہت اٹھ گئے دو چار ابھی باقی ہے
خیالِ مرگ سے ڈر کر تجھے قرار نہیں یہ ایک بار ہی آتی ہے بار بار نہیں

ملاپ چند راہی کا تعلق بھی اسی قافلے سے تھا جو پاکستان سے ہندوستان ہجرت کر کے آئے ۔وہ ۱۹۳۶ء میں ڈیرہ اسماعیل

خاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں انتقال کیا۔ ان کے ادبی ذوق کی نشو ونما میں انصار محشر عباسی کا بڑا اہم کردار ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہوسکا۔ یہ مثال دیکھیں:

میرے غم آپ کو اگر ملتے — آپ نے ہوش کھو دیے ہوتے
میرا دم ہے کہ مسکرا تا ہوں — آپ ہوتے تو رو دیے ہوتے

۹

ہردرشن سنگھ سہگل صاحب بھی انھیں حضرات میں شامل ہیں جو پاکستان سے ہجرت کر کے بیکانیر تشریف لائے۔ آپ ایک پختہ کار افسانہ نگار ہیں اردو کے موقر رسائل میں آپ کے افسانے شائع ہوئے ہیں جن میں شاعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر مدن کیولیہ ہندی کے پروفیسر رہے ہیں۔ ہندی ادب میں انھوں نے بحیثیت نقاد اور تخلیق کار اپنا مقام بنایا ہے۔ وہ اردو سے بھی واقف ہیں۔ انھیں طنز ومزاح سے خاص شغف ہے ان کے مزاحیہ مضامین اردو کی کتابوں میں شامل ہیں۔ کیولیہ جی شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔

رام کشن سائل دہلوی (پ ۱۹۲۲ء م ۱۹۸۹ء) کا شعری مجموعہ 'سرمایۂ ساحل' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے وہیں آپ کا بچپن گزرا اس لیے ان کی زبان پر دہلوی اثرات نظر آتے ہیں۔ غزل کے علاوہ نعت وحمد بڑے اشتیاق سے کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام دیکھیں:

کوئی وحشی کوئی مجنوں کوئی دیوانہ کہے — ہم کو دنیا نے دیے نام تری فرقت میں

ان کے علاوہ ستیہ پرکاش گپتا ناداںؔ اور پریم شنکر شرما وحشیؔ کا بھی تعلق بیکانیر سے رہا۔ وحشیؔ کا یہ شعر دیکھیں:

خدا غارت کرے اس تیرگی کو — ترستے رہ گئے ہم روشنی کو

۱۰

بیکانیر میں ادبی محفلوں کا انعقاد جس کثرت سے ہوتا ہے اس کی مثال راجستھان میں شاید ہی کہیں ملے۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں ان ادبی تقاریب کا اہم کردار ہے۔ یہاں کسی ایسی ادبی سرگرمی کا تصور نہیں کیا جاسکتا جس میں اردو ہندی اور راجستھانی شاعر اور ادیب شامل نہ ہوں۔ کسی بھی زبان سے متعلق کوئی بھی مجلس منعقد کی جائے اس میں سبھی زبانوں کے اہلِ قلم شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں لسانی تعصب کا نام ونشان نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ نئی نسل کے بہت سے لوگ بہ یک وقت تینوں زبانوں میں تخلیقی سرگرمی میں منہمک ہو گئے۔ اردو شاعری کے حوالے سے یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ نئی نسل کے تخلیق کار

اس طرف بڑے ذوق وشوق سے آئے ہیں۔ان میں ڈاکٹر منجو کچھاوا، جناب روی شکل، امت گوسوامی، سنجے ورن، اور رجندر سورن کار کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ان میں ڈاکٹر منجو کچھاوا صاحبہ کا ادبی سفر بہت دلچسپ رہا ہے۔ان کی شاعری خصوصًا ہندوستانی زبان کی خوبصورتی سے سجی ہوئی ہے۔ان کی شاعری میں اردو اور ہندی الفاظ کی عکاسی بڑی دل فریب نظر آتی ہے۔ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ تخلیقی میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں۔اگر چہ اردو رسم الخط سے واقف نہیں مگر اردو شعری روایت کا پورا خیال رکھتے ہوئے شعر کہتی ہیں۔چند ہی سالوں میں آدھا درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ایک مجموعہ دیوناگری اور اردو رسم الخط میں بھی شائع ہوا ہے ۔ اب تک ان کے مندرجہ ذیل مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انچھوئے پہلو ۲۰۱۶ء، گونجتی خاموشی ۲۰۱۸ء، میں نہیں ہوں ۲۰۱۹ء، یقین ہونے تک ۲۰۱۹ء، سیپیوں کی قید میں ۲۰۱۹ء، خواب پر چرچا ۲۰۲۰ء

ڈاکٹر صاحبہ کے چار ذاتی مجموعے اور تقریباً دس اجتماعی مجموعے ہندی رسم الخط میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔منجو کچھاوا فطری شاعرہ ہیں اگر یوں کہیں کہ وہ فنافی الشاعری ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ان کی شاعری ان کی قلبی کیفیات کی آئینہ دار ہے۔جس میں ہزار ہا رنگ پائے جاتے ہیں۔یہاں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس سے ان کی تخلیقی ثروت مندی کا انداز ہو سکے گا:

میں کوئی گل نہیں ہوں خوشبو ہوں
مجھ کو باندھو گے باولے ہو کیا

اگر دُعا ہی نہ نکلے زباں سے اس کی آنا
فقیر کا کبھی کشکول بھر نہیں سکتا

جن دیوں کی حفاظت میں لگا ہے کب سے
دھیان رکھنا وہ تیرے ہاتھ جلا سکتے ہیں

حق بیانی کے لیے کیسے کوئی لب کھولے
خوف طاری ہے سرِ دار بھی آ سکتے ہیں

درد الفاظ میں پرویا ہے
تم جسے شاعری سمجھتے ہو

صحن کا بوڑھا شجر سوچ رہا ہے تنہا
سبز ہوتا تو میری شاخ پہ طائر ہوتے

کیوں اٹھادی ہیں گھر میں دیواریں
جاؤ اب ان میں در تلاش کرو

روی شکل بھی بہت ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔وہ بڑی نفیس شخصیت کے حامل انسان ہیں یہی نفاست ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔اردو سے انھیں بہت لگاؤ ہے۔کم ہی وقت میں انھوں اردو اوزان و بحور اور زبان و بیان پر گرفت بنالی ہے۔ بہت ہی الگ طریقے سے شعر کہتے ہیں۔ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔سحر ہونے کو ہے دوسرا اور میں ہوں۔ان کا رنگ کلام دیکھئے

وقت کے ساتھ زمانے سے گزر جاؤ گے — خشک مٹی کی طرح ہاتھ سے چھٹ جاؤ گے
وقت ملبوس کے جیسے ہی بدل دے گا تمھیں — جسم پر حق نہ جماؤ کہ بکھر جاؤ گے
اٹھ رہا ہے نقاب پھولوں کا — دیکھئے تو شباب پھولوں کا
وصل کی رات میں کہاں فرصت — کون رکھے ہے حساب پھولوں کا

امت گوسوامی اوران کے بھائی است گوسوامی بیکانیر میں ایسی ہستیاں ہیں جواردو کے دیوانے ہیں۔انھیں اردو سے محبت وراثت میں ملی ہے۔ان کے والدکو غالبؔ کا تقریباً پورادیوان ازبر تھا۔یہی حال ان دونوں بھائیوں کا ہے غالبؔ کے بیشتر اشعار انھیں بھی یاد ہیں۔اس کے علاوہ وہ اردو کے قدیم وجدید شعرا کے اشعاراور پوری پوری نظمیں انھیں حفظ ہیں۔یہی نہیں وہ انھیں بخوبی سمجھتے بھی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں امت گوسوامی میدان شاعری میں اتر آئے اورشروعات ہی میں بڑی زوردار ان کی نظمیں اورغزلیں ان کے پختہ ادبی ذوق اورتخلیقی ذہانت کی غماز ہیں۔یہ شعر دیکھیں

کبھی نگاہوں میں کوئی سوال تھا ہی نہیں — جدا بھی ہوں گے کبھی ، یہ خیال تھا ہی نہیں
جو تو نہیں تو تری یاد ساتھ تھی ، کہ مجھے — یہ امتیازِ فراق و وصال تھا ہی نہیں

راجندرسورن کار چھند کے ماہرانھیں جہاں ہندی چھندوں پرعبور حاصل ہے وہیں اردواوزان پران کی مضبوط گرفت ہے۔سنجے ورن اگر چہ ہندی کے کوی ہیں مگران کا مزاج اردوشاعری سے ہم آہنگ ہےاورانھیں یہ مزاج ان کے والد سے ملا جو ہندی کے بہترین کوی اورشاعر تھے۔انھیں غزل سے خاص محبت تھی ان کی غزلیات کا مجموعہ ان کے انتقال کے بعد سنجے نے شائع کیا۔

سنجے کے والد گوری شنکر کی غزل کی زبان میں ہندی اوراردوزبان کا ملا جلا انداز پایا جاتا ہے۔سنجے بھی غزل اورقطعات کہتے ہیں اور بہت سلیقے سے کہتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دور میں بیکانیر میں ایک ایسی نسل سامنے آئی ہے جواردوشاعری کو نئے نئے امکانات سے روشناس کرانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ان میں سے کچھ نے اردو سے اپنی محبت سے مجبور ہوکراردورسم الخط بھی سیکھ لیا اورکچھ کوشش کررہے ہیں۔مجھے امید ہے کہ ہمارے یہ شاعرنہ صرف بیکانیر بلکہ پوری اردودنیا میں اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

حوالے:

۱۔راجستھان میں اردوزبان وادب کے لیے غیرمسلم حضرات کی خدمات ص۲۹۶ تا ۲۹۸
۲۔راجستھان میں اردوزبان وادب کے لیے غیرمسلم حضرات کی خدمات'' ص۳۰۲

۳۔ سوانح عمری رؤساو شرفائے بیکانیر جلد اول، ص نمبر ۱ تا ۲، مطبع جیل صدر، بیکانیر
۴۔ تاریخ ریاستِ بیکانیر ٹھاکر میگھ سنگھ، جیل پریس بیکانیر، ۱۸۹۸ء
۵۔ راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی خدمات ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی۔ ص ۲۹۹

6.European and Indo- European Poets of Urdu and persian, p -224-225

۷۔ راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی خدمات ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی۔ ص ۳۰۴
۸۔ دیوان حزیں، بودھی پرکاشن، جے پور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۹
۹۔ منقول از تذکرہ شعرائے بیکانیر، مرتبہ عزیز آزاد
۱۰۔ مارواڑ میں اردو، ڈاکٹر ضیاءالحسن قادری ۲۰۱۶ء ص ۳۳۲ تا ۳۳۳

(صفحہ ۴۱ کا بقیہ)

ماخذ:

(۱) شوکت علی خان صاحب مقدمہ ذکر جمیع اولیاء دہلی از ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
(۲) شوکت علی خان صاحب مقدمہ ذکر جمیع اولیاء دہلی از ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
(۳) فرہنگ آصفیہ، جلد اول ص ۵۸۴
(۴) لسان العرب جلد تین ص ۴۸۱ چاپ بلاق، مخزونہ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک

آنندرام مخلص کا تذکرۃ الشعراء کا تنقیدی مطالعہ

صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خان
ڈائرکٹراے پی آر آئی

تاریخ تہذیب وتمدن معاشرت ومعیشت ،سیاست و مدنیت، واقعات ومشاہدات اورسوانح ایک وقیع اوررفیع علم ہے جو اسلام کی دین ہے۔تاریخ خود اسلام کی تاریخی عظمت وحشمت کی ایک تاریخ ساز روایت ہے،اس روایت میں تاریخ کے دل بادل ذخائرآثارواخباراحکام واعلام،مصادرونوادراورمنابع ومراجع شامل ہیں۔صاحبزادہ شوکت علی خاں لکھتے ہیں

'تاریخ نویسی اسلام کا سرآغاز سرورق،سرنامہ اورسرتاج فنون ہے۔دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے اس فن کو روشناس کرایا۔جس میں سارے علوم جلوہ گرنظرآتے ہیں۔اسی سے علوم منضبط ہوئے اورتعمیر وتخلیق اورترویج کی راہیں ہموار ہوئیں (۱)

تذکرہ خود تاریخ کا منبع ہے،جس سے تاریخ بنتی ہے اورمرتب بھی ہوتی ہے تاریخ اورتذکرہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں جیسے جسم سے لہو،لہو سے روح اور پھول سے بو،تذکرہ تاریخ کی آبرو ہے اس کی روح ہے تاریخ اس سے بنتی ہے وہ تاریخ سے نہیں اس لئے تذکرہ کی اہمیت وافادیت تاریخ سے کہیں زیادہ ہے تذکرہ اصل واقعات اورواردات کا مسودہ ہے۔تذکرہ خود تاریخ کا علم بردار بھی ہے اورشواہد وحقائق کا آئینہ دار بھی،صاحبزادہ شوکت علی خاں تذکرہ جمیع اولیائے دہلی کے مقدمے میں رقم طراز ہیں

'تذکرہ بھی تاریخ نویسی کا جزولاینفک ہے جوخود تاریخ ہے اورعلم بھی،فن بھی،قوت استدراک واستدلال بھی اورتاریخ کا مخزن بھی،تذکرہ خود تاریخ کا آئینہ بھی ہے اورآئینہ خانہ بھی،جلوہ بھی اورنہاں خانہ بھی،ترجمہ بھی اورمقدمہ بھی سرآغاز بھی اورسرانجام بھی،سردفتر بھی اورسرورق بھی،تاریخ کی بازیافت بھی' (۲)

ماہرین فن اورجامعین لغات نے بہت کچھ لکھا ہے۔تاریخ کسی حادثے یاواقعے کا تعین اورتشخص عصر اورذکرو واقعات بزرگان ودلاوران علماء وفضلا،شعراء وادبا اورروایات جنگ وجدل کا نام ہے۔(۳)

مشہورومعروف صاحب لسان العرب نے تاریخ کو ارق سے مشتق مانا ہے (۴)

عصر حاضر کے محققین،مؤرخین نے سوانح اورتذکرے کوتاریخ کا حصہ نہیں،خود تاریخ کہا ہے عام طور سے تذکروں

میں چار قسم کے تذکروں کی نشان دہی یا حد بندی کرنی ہوگی

(۱)ایک قسم تو صرف شعراء کے تذکرے جن میں صرف شعراء کے سوانحی حالات، واردات، واقعات اور ان کا نمونۂ کلام ملتا ہے۔

(۲) دوسری قسم ملفوظاتی ادب کی ہے ان میں اصفیا، اولیاء اور اتقیا کے ملفوظات ہوتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم ایسے تذکروں کی ہے جو مشاہیر ادباء کے تذکرے ہیں جن میں تاریخی یا ادبی مواد کے ساتھ ساتھ ان کے کلام اور اشعار کا پتہ چلتا ہے۔

(۴) چوتھی قسم ہے ان تذکروں کی جو سوانح کے ساتھ بڑے تواریخی تذکرے ہیں جن میں صرف تاریخی واقعات و واردات، کارنامے اور محاربات اور مہمات کے احوال ملتے ہیں۔

یوں تو ہندوستان اور بیرون ہند میں کئی تذکرے لکھے گئے۔ ہندوستان میں عوفی کا تذکرہ لباب الالباب پہلا فارسی کا تذکرہ ہے جو ۱۲۲۱ء / ۶۱۸ھ میں ترتیب دیا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں بہت تذکرے لکھے گئے۔ ان سب کو میں صرف نظر کرتا ہوں اور مخلصؔ کے دور کے اور اس ہم عصر کے تذکرے مثلاً 'گل رعنا' 'چمنستان شعراء' 'شام غریباں' 'آتش کدہ' 'عقد ثریا' 'تذکرہ فارسی' 'صحف ابراہیم' 'مخزن الغرائب' 'طبقات الشعراء' 'تذکرہ عشق' 'سفینہ ہندی' اور 'سفینۂ خوشگو' ہے لیکن میرا موضوع سخن تذکرۃ الشعراء آنند رام مخلصؔ بن راجہ ہردی رام کھتری لاہوری ہے۔

مخلصؔ کی تصانیف میں تذکرۃ الشعراء سب سے اہم نادر اور نایاب تصنیف ہے جو اس کے قلم کا مکتوبہ ہے اور اصل مبیضہ ہے۔ اس میں ۱۸۰ اوراق ہیں ۱۷x۲۳ سینٹی میٹر طول و عرض اور ۱۵ سطور ہیں۔ نستعلیق شکستہ آمیز خط میں ہے جو قلم کی روش کے اعتبار سے مشاقی اور پختگی کا آئینہ دار ہے۔ کہیں کہیں آب رسیدہ اور کرم خوردہ ہے۔

مفید حواشی سے پر یہ جے پور کے مہاراجہ پبلک لائبریری کے حکیم چتر سنگھ کے ذخیرے سے منتقل ہوا ہے۔

تذکرے کے ۳۶۰ صفحات ہیں

۴۰۲ فارسی شعراء کے سوانح مع ان کے کلام مندرج ہیں۔ یعنی ہر شاعر کو تقریباً ایک ایک صفحہ ملتا ہے۔ حالانکہ کہیں کہیں شاعر کا نام اور اس کا ایک ہی شعر دینے پر بھی اکتفاء کیا ہے۔ بعض مشہور شاعروں کا کئی کئی صفحوں میں ذکر کیا ہے۔ ان میں اپنے استاد عبدالقادر بیدلؔ اور اس کے معاصر شاعر سراج الدین خان آرزوؔ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح

صائبؔ، دانشؔ، فیضیؔ، عرفی، معزموسوی خاں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے، جہانگیر بادشاہ کے بارے میں بھی اس نے قدرے تفصیل سے ہی نہیں بلکہ دو جگہ لکھا ہے۔ آرزؔو کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے ویسے بھی آرزؔو اس کے جلیس اور رفیق تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرزؔو سے حد درجہ متأثر تھا اور بیدلؔ کے بعد آرزؔو سے وہ اصلاح بھی لیتا تھا۔

تذکرۃ الشعراء میں سمجھتا ہوں دنیا کا وحید العصر اور فرید الدہر نسخہ ہے جو اب تک کسی فہرست مخطوطات اور ملکی و بیرونی کیٹلاگ میں مندرج نہیں۔ مشہور مستشرق سی۔ اے۔ اسٹوری نے بھی آنند رام مخلصؔ کی تمام و کمال تصانیف پر تبصرہ کیا ہے مگر اس تذکرے کا کہیں ذکر نہیں کیا اور اب تک کسی مطبوعہ تذکروں میں بھی مخلصؔ کے اس تذکرہ کا کسی نے حوالہ تک نہیں دیا اس سے یہ ثابت ہے کہ اب تک یہ اہم تذکرہ کسی کی نظر سے نہیں گذرا اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مخلصؔ کا یہ تذکرہ مبیضہ اور مسودہ کی شکل میں پردۂ خفا میں ہی پڑا رہا اور امتداد زمانہ سے یہ جے پور میں غدر کے بعد کسی نہ کسی طرح آ گیا۔ حکیم چتر سنگھ جے پور کے مشہور حکیم اور سرپرست علم و ادب کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ حکیم صاحب نے اپنا ذخیرہ مہاراجہ پبلک لائبریری جے پور میں کب دے دیا اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ جب مہاراجہ پبلک لائبریری جے پور کا ذخیرہ پہلے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی برانچ جے پور میں منتقل ہوا اور وہاں سے عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں منتقل ہوا اس لحاظ سے تذکرۃ الشعراء عزیز الدہر نسخہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایسا معلوم پڑتا ہے کہ مؤلف نے اس کو مرتب کرتے وقت دوبارہ بھی دیکھا ہے اور تصحیح کی ہے جیسا کہ حواشی سے بھی ظاہر ہوتا ہے وہ اس کو نقل کرواتے، اس کی نقول کرتے یا اس کو زمانے کے لحاظ سے احباب میں تقسیم کرتے جو وہ نہیں کر سکے۔ اور یہ واحد نسخہ اسی طرح قعر گمنامی میں پڑا رہا، جب صاحبزادہ شوکت علی خاں نے انگریزی میں وضاحتی فہرست بنانا شروع کی اس وقت اس اہم نسخہ کی انھوں نے بازیافت کی اور اس کو کافی کھنگالنے پر اس کو نادر قرار دیا اس کے علاوہ شوکت صاحب کے محبّ مکرم پروفیسر نثار احمد فاروقی جو فی زمانہ ایک بلند مقام محقق اور اعلیٰ پایہ کے عالم و فاضل ہیں نے ادارے کے نوادر کا جب مطالعہ کیا تو اس تذکرہ کو اہم بتاتے ہوئے آنند رام مخلصؔ کا قلمی نوشتہ ہی قرار دیا۔ وہ اس سے اتنے متأثر ہوئے کہ اس کو ایڈٹ کرنے کی پیش کش کی لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں اس کو اپنی پی ایچ ڈی کا موضوع بنا رہا ہوں تو بہت سراہتے ہوئے اپنی اس پیش کش کو واپس لے لیا۔

اس نسخہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خود اس کے قلم کا ہی شاہ کار ہے۔ جگہ جگہ حاشیہ پر اس کے اشعار اور تصحیحات

اور ضمیموں کا دینا اور کہیں کہیں اپنا نام اور تخلص لکھنا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس کے خود کے قلم کا نوشتہ ہے مثال کے طور پر 'میم' کے شعراء پر تبصرہ کرتے وقت 'ایں مخلصؔ ہیچ مداں' 'راقم ایں سطور' لکھتا ہے۔ شیخ محسن فانؔی کے ذکر میں وہ اس طرح رقم طراز ہے 'شعر بسیار خوب می گفت، صوفی مشرب است دیوانی دارد قریب شش ہفت ہزار بیت آں فقیر در کتب خانہ خود دارم' اسی ضمن میں مخلص پھر لکھتے ہیں 'راقم السطور نیز دریں زمین مطلعی و حسن مطلع دارد نوشتہ می شود'

بر احوالم کہ امشب داشت رحمی بر میزبانی ہم
ادب بگذاشت در دل بگویم بیزبانی ہم

اس کے بعد 'مخلص' کے دستخط ثبت ہیں آگے پھر وہ اپنے آپ کو 'فقیر مخلص در مصرع تصرف می کند بجائے عجائب اگر قیامت باشد بہتر است' آگے اپنے بارے میں وہ اس طرح رقم طراز ہیں 'ایں مخلصؔ ہیچ مداں و کج مج زبان اگر خود را قابل این نمی داند کہ در زمرۂ خوش سخنان رنگی بیان اشعار خود را بقلم آرد لیکن بنا بر یادگار اشعار چند تحریر می آرد' اس کے بعد اس نے اپنے اشعار نقل کئے ہیں۔ آگے صفحہ ۲۸۱ پر ایک مزید واضح ثبوت اور ملتا ہے اس کے ایک حاشیہ میں بخط شکست مخلصؔ نے ایک طویل حاشیہ اس طرح لکھا ہے 'پوشیدہ ارباب سخن و صاحبان ایں فن مباد۔۔۔۔۔۔۔ سعدی شیرازی کہ سر کردن دادی ۔۔۔۔۔ الخ حررہ بندہ دولت رائے رایان آنند رام مخلصؔ' اس حاشیہ کی عبارت سے بالکل طے شدہ امر ہو جاتا ہے کہ یہ خود مخلصؔ کا ہی نوشتہ نسخہ ہے۔ اس لئے کہ پورے نسخہ میں اس نے اس سے زیادہ واضح ثبوت نہیں دیا۔ اشاروں ٹکڑوں میں کہیں کہیں مخلص، کہیں ہیچ مداں وغیرہ دیا ہے اس حاشیہ میں اس نے اپنا نام مع خطاب کے دیا ہے یعنی 'رائے رایان آنند رام مخلص' رائے رایان کا جیسا جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے خطاب ملا تھا اس حاشیہ کی عبارت گتھواں خط شکست میں ہے جو پورے حاشیوں اور متن کی عبارت سے بعینہ ملتی ہے۔ اندرونی شواہد نے اس کو اور بھی وقیع و رفیع و صحیح بنا دیا ہے اندرونی شواہد کے علاوہ خارجی شواہد، گہ سر عنوان، تمہید، لوح، بین السطور جگہ جگہ شعروں پہ ا۔۲۔۳ اور صاد کا بنانا کچھ اشعار کا حاشیوں پر لکھنا اور کہیں کہیں تصحیحات کرنا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ یہ نسخہ مخلصؔ کا اصل مسودہ ہے، جس کی وہ نقل دوبارہ نہیں کر سکا۔ یہی وجہ کہ اس نے بعد میں بعض شعراء کے اشعار پر 'ص' کے نشانات اور کچھ سوالیہ علامات دے رکھی ہیں جن کو وہ اس مبیضہ کو صاف کرتے وقت نکال دیتا یا کمی کرتا یا بالکل ہی اڑا دیتا یا ان کی صحت کرتا، پھر بھی یہ مبیضہ اس انداز سے ضبط تحریر کیا گیا ہے کہ اس کو صاف مخطوطہ یا واضح مسودہ کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اندرونی شواہد کا ایک ثبوت اور اس طرح ملتا ہے کہ مؤلف محمد طاہر غنی کشمیری

کے باب میں اس طرح رقم طراز ہے 'راقم السطور نیز این غزل گفتہ بیتی چند از آن مرقوم می شود' اس کے بعد صرف مخلص لکھ کر اس نے اپنے چار اشعار لکھ دیئے ہیں۔

اس تذکرہ میں مخلص نے کہیں کہیں قدیم اور جدید تذکروں کا ذکر کیا ہے۔جس میں زیادہ تر تحفۂ سامی والہ داغستانی مآثر رحیمی، کلمات الشعراء، مجمع النفائش، دیوان آرزو، بیاض آرزو، مولانا واثق کا ذکر ملتا ہے سب سے زیادہ وہ مولانا واثق کی بیاض کا ذکر کرتا ہے، کہیں بیاض واثق، کہیں بیاض، کہیں مرزا واثق، ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان متذکرہ تذکروں کے ساتھ مولانا واثق کی بیاض مؤلف کا بنیادی ماخذ ہے وہ بیاض اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہے پھر بھی تذکرہ کی داخلی شواہد وحقائق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے وقت کے مستند دواوین اور مشہور تذکروں کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے انداز سے صحت، ثقاہت سے شعراء کا نمونۂ کلام اور احوال دیئے ہیں۔ جہاں اس کو سنین معلوم ہو سکے وہاں اس نے سنین اور تواریخ لکھ دیئے، جہاں اس کو صحت نہیں معلوم ہوسکی وہاں 'نقل است' لکھ کر اس نے تاریخی واقعے یا 'حال' یا نمونۂ کلام درج کر دیا۔

ان ہی داخلی شواہد اور صحت متن کا لحاظ رکھتے ہوئے جب غائر نظر سے تنقیدی جائزہ لیا گیا تو بہت سے اشعار وزن میں نہیں ملتے۔مؤلف نے لکھتے وقت صحت قیاسی کا خیال نہ کرتے ہوئے کسی کسی دیوان سے نقل کرتے وقت کوئی لفظ یا حرکت یا غلط حرف نقل سے رہ گیا ہو یا صرف نظر ہو گیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بیاض اور دیوان میں ہی غلط منقول ہو۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اس کو صاف کرتے وقت ان اغلاط کو درست کرتے ،متن کے مطالعہ سے ایسا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قرأت کہیں کہیں واضح نہیں ہوتی کہیں کہیں ایک مصرعہ ایک بحر میں اور دوسرا مصرعہ دوسری بحر میں ہے۔بعض اشعار بحر سے ساقط ہیں۔

اس کے علاوہ عبارت میں بہت سے حروف اور الفاظ مرکبات اور جزئیات اور مفردات املا اور انشاء قواعد وضوابط سے خارج ہیں۔ کہیں کہیں سہواً بھی الفاظ غلط لکھ دیئے گئے ہیں ثروت کو سروت سین مہملہ سے لکھا ہے جب کہ 'ث' سے لکھا جانا چاہئے۔اس میں ہوسکتا ہے کہ روش قلم سے نقاط لگانا رہ گئے ہوں، مگر آگے دیوان ضخیم کو 'ذ' سے لکھا ہے۔اسی طرح دوسری جگہ پھر 'دیوان صخمی' لکھ دیا جب کہ دیوان ضخمی لکھنا چاہیے تھا۔سنائی کو ایک جگہ صاد مہملہ سے تحریر کیا ہے اور دوسری جگہ سین سے صحیح لکھا ہے مؤلف 'باتمیاز' کو ہمیشہ دو میم سے لکھتا ہے یعنی 'باممتاز' ایک جگہ میرزا کو 'میرز' لکھ دیا جو اس کی غلطی تسلیم نہیں کی جا سکتی، الف روانی میں محل نظر ہوسکتا ہے، تعجب کا مقام ہے کہ مخلص 'قدرت' کو ہر جگہ قدردت ہی لکھتا ہے اسی طرح 'صوبہ داری' کو 'صوبداری' لکھتا ہے ایک جگہ 'سادہ رویان' کے بجائے 'سادہ روان' لکھ دیا گیا۔اس طرح طبیعی کو طبعی لکھ دیا جو وزن سے

خارج ہے۔ اس میں ہوسکتا ہے کہ 'ی' کا شوشہ محو نظر ہو گیا ہو۔ ایسے اور بھی امور ہیں جہاں کہیں تو کوئی لفظ یا حرف قلم زد ہو گیا ہے اور کہیں محل نظر یا روانی قلم میں رہ گیا ہے۔ بعض املا قطعا غلط ہو گئی۔

مخلص کا قلم دوران کتابت میں جلی واضح اور پرکار رہے کہ وہ ایک اچھا خطاط بھی تھا دور و دامن جوف اور نشست و کرسی کا غیر شعوری طور سے لحاظ کیا گیا ہے۔ میم اور واو کی گھنڈیاں اکثر بند شدہ ہیں۔ کششیں اور مراکز بہت واضح اور پرکار ہیں۔ اکثر شوشوں اور جوڑ اور پیوند کا روانی میں خیال رکھنا وہ بھول جاتا ہے پھر بھی دوسرے قواعد کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ ر۔ و۔ ز کے پرّ وں کا لحاظ کیا گیا ہے اسی طرح کرسی اس کی بہت درست نظر آتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ماہر خطاط ہے اور اس کا قلم ممارست و مہارت کا مظہر ہے

مخلص کا یہ منفرد اور نو دستیاب تذکرہ گو فارسی تذکروں کے زمرے میں آتا ہے اور کم و بیش ان تذکروں سے ماخوذ بھی ہے جن کا حوالہ سطور بالا میں دیا گیا ہے لیکن اس نوعیت سے اہمیت و ندرت کا مظہر ہے کہ اس میں ان شعراء کا بھی نام درج ہے جن کا حوالہ کہیں نہیں ملتا۔ حالانکہ مخلص نے بھی ایک دو شعر نمونۂ کلام کے اور صرف نام ہی دینے پر اکتفاء کیا ہے۔ اس لئے ان کے بارے میں کچھ نہیں مل سکا اس نے اسماء تو دے دیئے ہیں اور ایک دو اشعار ڈھونڈ ھ نکالے ہیں۔ یا اپنے معاصرین سے اس نے سن کر نقل کئے ہیں۔ نیز اس اعتبار سے بھی یہ کافی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مخلص کے معاصر شعراء بالخصوص رفقاء کار اور احباب کے احوال اور اوران کا نمونۂ کلام کافی زیادہ ملتا ہے۔ مزید برآں اس نے روایت سے یا سینہ بہ سینہ احوال اخذ کر کے نہیں دیئے ہیں۔ بلکہ اپنی جانب میں تحقیق کر کے کہیں اصلاح کے ساتھ، کہیں حوالوں کے ساتھ پیش کئے ہیں، اور موجود و محفوظ تذکروں اور بیاضوں کو جستجو کر کے کھنگالا ہے جو اس کے کتب خانے کی زینت بنے رہے ہیں اس لئے کہ وہ صاحب علم و فن امارت و وکالت و وزارت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی رہا ہے اور اپنے معاصر شعراء ادباء اور علماء کا محسن و سرپرست بھی رہا ہے۔

اس لئے اس کو عصری ادب مغلیہ کا غذات و مبیضات اور مسودات کے حصول میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آسکتی تھی، اس لحاظ سے ثقاہت و روایت کا بھی پورا پورا خیال کر لینا بھی اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کی یہ کوشش و کاوش اور دقت پسندی اور پیہم جستجو سلطنتی کاروبار میں مصروف ہونے کے باوجود قابل تحسین ہی نہیں تقلید طلب اور مستحسن کے مترادف ہے جو فارسی ادبیات کا قابل قدر سرمایہ اور ثقافتہ ورثہ ہے (بقیہ ص ۳۵ پر)

رسالہ شاعری کی کایاپلٹ ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ارشد سراج
قائم مقام پرنسپل گورنمنٹ کالج باڑی دھول پور

'شاعری کا کایا پلٹ' ایک سہ ماہی جریدہ ہے جو والیٔ ریاست جھالا واڑ راج رانا بھوانی سنگھ کی سرپرستی میں صاحبزادہ محمد فیاض علی خاں رئیس دوجانا پریسیڈنٹ انجمن سخن جھالا واڑ کی ایماء پرسید مصطفیٰ حسین رضوی نے ترتیب دے کر سنٹرل جیل پریس جھالرا پٹن (جھالا واڑ) سے طبع کرا کے جاری کیا تھا رسالہ کا سائز ۳۶/۸X۲۰ اور سرورق کو ملا کر ۴۰ صفحات (۳۶+۴) پر مشتمل ہے سرورق پر صفحہ ۱ و۲ اور رسالہ کے آخری صفحہ پر ۳ و۴ درج ہے۔ سرورق ایک نہایت خوب صورت چوکور بیل سے مزین ہے اوراس کے درمیان نصف صفحہ پر جلی حروف میں 'شاعری کی کایا پلٹ' لکھا گیا ہے اسی کے ٹھیک نیچے کی جانب 'اردو علم ادب کا دل کش شہ ماہی مرقع ملک کے اہل قلم کا دماغی ذخیرہ بہ سرپرستی مخزن علوم ومعادن ہز ہائی نس سری حضور مہاراج رانا بھوانی سنگھ بہادر آف جھالا واڑ دام اقبالہم و حشمتہم' بھی لکھا گیا ہے بعدازیں سرورق پر مرتبہ سید مصطفیٰ حسین رضوی سپرنٹنڈنٹ فاریسٹ سکریٹری انجمن سخن درج ہے اس کے ذیل میں مقام اشاعر 'دفتر انجمن سخن' قلعہ معلیٰ جھالرا پاٹن 'راج پوتانہ' اور بیل کے درمیان چھوٹے حروف میں جیل پریس جھالرا پاٹن میں طبع ہوا درج ہے۔ سرورق کے صفحہ ۲ پر فہرست مضامین اس انداز سے لکھی ہوئی ہے: فہرست مضامین

(۱) دیباچہ سکریٹری انجمن
(۲) پرانی شاعری لالہ شمبھو دیال دانش دہلوی جھالرا پاٹن
(۳) ایک زاہد کی نجات مولوی محفوظ الرحمٰن یک رنگ سررشتہ دار عدالت فوجداری جھالرا پاٹن
(۴) بھارت کا انقلاب منشی باسدیو پرشاد وفا، مصاحب مہاراج رانا صاحب بہادر جھالرا پاٹن
(۵) انقلاب زمانہ صاحبزادہ فیاض علی خاں رئیس دوجانہ پریسیڈنٹ انجمن سخن
(۶) ایک چھترانی رانی کی نصیحت اپنے بیٹے کو سکریٹری
(۷) تعلیم نسواں جھالا واڑ میں منشی وجیہ الدین حیفؔ

غزلیات طرحی کیا نظارہ بزم غیر میں اس ماہ طلعت کا

آثؔر، تسلیمؔ، حیدؔر، رنگیںؔ، زاہدؔ، سلطاںؔ، شاعؔر، شرؔر، صابؔر، صادقؔ، عزیزؔ، کیفؔ، نیرنگؔ، ہلالؔ۔ فہرست مضامین کے بعد کے صفحہ پر (اس پر صفحہ نمبر نہیں ہے) مدیر رسالہ سید مصطفیٰ حسین رضوی کا التماس درج ہے اور اس کی پشت پر ڈرامہ پر ایک دقیق نظر' 'کلام دانش' اور 'رسالہ جنگ یورپ' کے اشتہارات دیئے گئے ہیں۔ صفحہ نمبر ا سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ رسالہ ہٰذا کے دیباچہ کا آغاز ہوا ہے۔ یہ دیباچہ صفحہ ۸ پر ختم ہوگیا ہے۔ دیباچہ میں سید مصطفیٰ حسین رضوی نے رسالہ ہٰذا کے اجرا کے اغراض و مقاصد کی نشان دہی اس انداز سے کی ہے۔ دیباچہ کا یہ اقتباس اس ضمن میں پیش ہے:

'انجمن سخن قائم کرنے سے جہاں سری حضور کا منشا بقائے اردو زبان کو صیقل کرنا تھا وہاں یہ بھی خیال تھا کہ شعراء حال صرف پرانی لکیروں کو ہی نہ پیٹیں اور اس کورانہ تقلید سے جو وہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں بچیں اور صرف گل وبلبل کے افسانے یا جھوٹی عشق کی کہانیوں سے ہی ورق سیاہ نہ کریں اور اس بیسویں صدی میں جب کہ زندگی کی کش مکش روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مذاق سلیم کے تفنن طبع کے لئے دن دونی اور رات چوگنی دل چسپیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بیٹھے صرف عورتوں سے ہی باتیں نہ کیا کریں بلکہ زبان کو بھی وسعت دیں۔ جذبات واحساسات کی طرف جو شاعری کا اصلی موضوع ہے، اپنے خیال کو متوجہ کریں۔ تاریخی واقعات، نیچرل مضامین، مناظر قدرت اور واقعہ نگاری وغیرہ کے سدابہار گلشن کی گلگشت کریں اور عشق و محبت کی تنگ راہوں سے گریز کریں' (۱)

دیباچہ کے اختتام کے بعد رسالہ ہٰذا میں شامل نظموں کا آغاز ہوا ہے اس کی پہلی نظم 'پرانی شاعری' کے عنوان سے منشی شمبھو دیال دانشؔ دہلوی کی درج ہے۔ دانشؔ کی یہ ایک طویل نظم ہے جو ۱۹۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ قصیدہ کہی جا سکتی ہے اس میں نو شعر تشبیب نو شعر مدح کے اور اس کے بعد پرانی شاعری سے متعلق اور آخر میں تین شعر دعائیہ دیئے گئے ہیں۔ نظم میں پرانی شاعری کے غیر افادی مفہوم جو محض ادب برائے ادب کے نظریئے پر وجود میں آتی ہے کو بیان کیا گیا ہے یہاں اس کا یہ بند بطور نمونہ کے پیش ہے

کبھی ایسی کرتے تھے ہم شاعری — کہ خود بے حیائی بھی شرماتی تھی
رقیب اپنے فرضی بناتے تھے ہم — شرافت کو بٹہ لگاتے تھے ہم
کبھی وہ مضامین موزوں کئے — کہ شیطان کو بھی نہیں سوجھتے
کسی کی برائی پہ گر پل پڑے — تو شائستگی کو رلا کر اٹھے

سراپا کسی کا اگر لکھ دیا	تو بے غیرتی نے بھی منھ ڈھک لیا
تعلّی میں ہوں شعر ڈوبے ہوئے	بلا سے ہوں مخرب وہ اخلاق کے (۲)

اس کے بعد مولوی محفوظ الرحمٰن یکرنگ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی کی طویل نظم 'ایک عابد کی نجات' شامل اشاعت ہے یہ نظم ۱۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ پوری نظم قصیدہ کی ہیئت میں ہے بطور نمونہ چند اشعار یہ ہیں:

ایک عابد تھا مقیم ملک شام	تھا وہ مصروف عبادت صبح و شام
قرض انسانی میں حق کی بندگی	اس نے جانی تھی مآل زندگی
دن گزارا زہد میں طاعت میں رات	تھی یہ اس کی زندگی کی کائنات
بے عبادت کے نہ کھویا اک نفس	ہوگئے تھے اس کو یوں صدہا برس (۳)

بعد ازیں بھارت کا انقلاب کے عنوان سے ۳۸ بندوں پر مشتمل طویل نظم پنڈت باسدیو پرشاد کی موجود ہے بطور نمونہ اس کا یہ بند ملاحظہ ہو:

ترا ہائے بھارت تھا کیا زمانہ	کہ اب تک زبانوں پہ ہے وہ فسانہ
نہ تھا تیری عظمت کا کوئی ٹھکانہ	تو علم و ہنر کا تھا گویا خزانہ
زمانہ میں وہ شان و شوکت تھی تیری	کسی کی نہ تھی جو کہ عزت تھی تیری (۴)

اس کے علاوہ 'انقلاب زمانہ' کے عنوان سے اگیارہ اشعار پر مشتمل صاحبزادہ فیاض علی خاں فیاضؔ رئیس دوجانہ کی نظم شامل ہے یہ مختصر نظم غزل کی ہیئت میں ہے، مطلع یہ ہے:

نہ وہ شکوہ نہ عزّ و وقار باقی ہے
نہ منعموں میں ہمارا شمار باقی ہے

مقطع یہ ہے:

بلائیں سارے زمانے کی ہو چکیں فیاض
بس ایک آمد روز شمار باقی ہے (۵)

اس کے بعد مدیر موصوف کی طویل نظم 'ایک چھترانی رانی کی نصیحت اپنے بیٹے کو' شامل ہے یہ نظم رسالہ ہٰذا کی سب سے طویل نظم ہے اس میں ۱۹۰ اشعار ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

رو برو اس نے بلا کر کے پسر کو اپنے　　پیار سے اس کو لیا پہلے تو سینے سے لگا
پھر مخاطب یوں کیا غیظ وغضب میں آ کر　　سنجیا کون ہے تو اور ہے کس کا بیٹا
چھتری ونش سے شاید تو نہیں ہے ورنہ　　جنگجوؤں کا بنے ننگ یہ کب ہے زیبا
کچھ بھی تونے نہ کیا اپنی شرافت کا خیال　　کون عزت سے ترا نام جہاں میں لے گا (۶)

بعدازیں 'تعلیم نسواں جھالا واڑ میں' کے عنوان سے منشی وجیہ الدین حیفؔ تلمیذ حضرت منیؔر وامیؔر مینائی کی ۳۶ اشعار کی نظم موجود ہے۔رسالہ ہٰذا کے حصّہ منظومات کی یہ آخری نظم ہے اس کے بعد غزلیات کے حصہ کا آغاز ہوا ہے۔اس نظم کے چند شعر یہاں نمونہ کے طور پر دیکھئے:

یہ نہیں مطلب کہ بی اے یا ایم اے پاس ہوں　　کچھ غرض اس سے نہیں حاصل کریں یہ ڈگریاں
ہے غرض تعلیم سے جس سے کہ ہوا خلاق ٹھیک　　ان کی ہراک بات میں ضرب المثل ہوں نیکیاں
لکھنے پڑھنے میں نہ یہ محتاج اوروں کی رہیں　　انتظام خانہ داری میں ہوں یکتا بی بیاں (۷)

حصہ غزلیات میں شعراء کی طرحی غزلیں دی گئی ہیں مصرعہ طرح یہ ہے

کیا نظارہ بزم غیر میں اس ماہ طلعت کا

اس کے بعد شعراء کا کلام اس انداز سے شروع ہوتا ہے:

اثرؔ:۔جناب منشی سکندر خاں صاحب اثرؔ محرر جنگلات تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی

رباعی

اگلی سی زمانے میں وہ الفت نہ رہی　　آنکھوں میں حیا دل میں مروت نہ رہی
وہ تفرقہ دیکھا کہ الٰہی توبہ　　بھائی کو بھی بھائی سے محبت نہ رہی

غزل تعداد اشعار اگیارہ

مٹاکر اپنی ہستی وہ جمایا رنگ وحدت کا　　نمایاں ہے مری صورت سے جلوہ اس کی صورت کا
نہ آنکھوں میں مروت ہے نہ ہمدردی دل میں ہے　　زبانی اب فقط اظہار کرتے ہیں محبت کا

تسلیمؔ:۔جناب رفیق بیگ تسلیمؔ تلمیذ نیرنگؔ کاکوروی ۔تعداد اشعار تیرہ

مرے آقا کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے سخاوت کا — کہ بخشا اختیار نظم پبلک کو ریاست کا
غضب کی نیند ہے پر وہ پڑا ہے خواب غفلت کا — کچھ ایسے سو گئے ہیں ہوش عزت کا نہ ذلت کا (۸)

حیدرؔ:۔ جناب منشی سید حیدر حسین رضوی حیدرؔ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔تعداد اشعار سات

میں اکثر دیکھ کر آئینہ دل ہی دل میں کہتا ہوں — مری صورت ہے یارب اک نمونہ تیری قدرت کا
زمانے کی عدالت نے دلوں میں تفرقہ ڈالا — وہ ٹوٹا سلسلہ قائم جو تھا صاحب سلامت کا (۹)

رنگینؔ:۔ جناب منشی منیر بیگ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔تعداد اشعار سات

ازل میں وقت آیا جس گھڑی تقسیم خلعت کا — تو بیٹھا ٹھیک میرے جسم پر جامہ مصیبت کا
تماشا دیکھنے والے تو ہم نے سینکڑوں دیکھے — نہ دیکھا پوچھنے والا کوئی رنج و مصیبت کا

زاہدؔ:۔ جناب حافظ الٰہی بخش زاہدؔ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔تعداد اشعار پانچ

کسی تدبیر سے ایام غم کاٹے نہیں کٹتے — گزر جاتا ہے دم بھر میں زمانہ عیش وراحت کا
الٰہی ہندو و مسلم میں ایسا عشق باہم ہو — کہ نقش کالحجر ہو دل میں ان کے نقش الفت کا (۱۰)

سلطانؔ:۔ جناب مرزا سلطان بیگ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔تعداد اشعار دو

خیال اس دشمن تہذیب کا آئے تو یہ سمجھو
کہ پھانسی زلف ہے اور دار اک نقشہ ہے غارت کا (۱۱)

شاعرؔ:۔افسر الشعراء جناب آغا شاعرؔ قزلباش دہلوی ایڈیٹر آفتاب یادگار حضرت داغؔ مرحوم۔تعداد اشعار گیارہ

فقط کھلنے نہ کھلنے تک ہے وقفہ رنج و کا — دہن غنچے کا ہے گویا خزانہ غم کی دولت کا
کلیجے چاک کر دیتا ہے لپکا جذب الفت کا — پہاڑوں سے بھی تو رکتا نہیں شعلہ حرارت کا (۱۲)

قطعہ (سیاست اور عدالت) تعداد اشعار سولہ

زمانہ آج کل نا منصفی کا سخت شاکی ہے — نہیں انصاف کے گھر میں بھی چسکا راعدالت کا
مگر جو نیک دل فرمانروا ہیں ان کا کیا کہنا — دکھا دیتے ہیں وہ اب بھی نمونہ ابر رحمت کا (۱۳)

شررؔ:۔ جناب حافظ محمد یٰسین شررؔ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔تعداد اشعار چار

سمایا ہے مری آنکھوں میں عالم شان وحدت کا نظر آتا ہے ہر ذرہ میں جلوہ اس کی قدرت کا (۱۴)

صابرؔ:۔ جناب منشی عبداللہ خاں تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔ تعداد اشعار چھ

انھیں دم بھر کو بھی موقع نہیں ملتا ہے فرصت کا سناؤں کس طرح احوال میں اپنی مصیبت کا (۱۵)

صادقؔ:۔ جناب منشی صادق علی خاں تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔ تعداد اشعار تین

عجب مضمون دیکھا ہم نے دشمن کے مخمس میں حسد کا بغض کا نخوت کا کینے کا عداوت کا (۱۶)

عزیزؔ:۔ جناب محمد عزیز الرحمٰن تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔ تعداد اشعار چار

طبائع مختلف پیدا کئے خالق نے دنیا میں چمن میں دیکھئے ہر گل جدا ہے اپنی رنگت کا (۱۷)

کیفؔ:۔ استاد جناب حافظ محمد عالم گیر خاں کیفؔ یادگار فوقؔ۔ تعداد اشعار دس

قیامت ہے نہ ہونا آدمی میں آدمیت کا نہ ہو سیرت تو اک حیوان ہے انساں کی صورت کا (۱۸)

نیرنگؔ:۔ جناب استاد مولوی عبدالوحید نیرنگؔ کاکوروی تلمیذ حضرت محسنؔ کاکوروی۔ تعداد اشعار اگیارہ

یہ کہہ دو قیس سے اب دور ہے علم و فراست کا سبق لے مکتب لیلیٰ میں آکر عقل و حکمت کا

پریشاں خاطری بھی کیا بلا ہے زندگانی میں گناہوں میں ملی لذت نہ لطف آیا عبادت کا

میں اپنی آرزوئیں خاک میں بے شک ملا دیتا جو اک ذرہ بھی ہوتا قلب میں گرد کدورت کا

برابر دونوں پہلو کب رہے میزان عالم کے سبک الفت رہی جھکتا رہا پلہ عداوت کا

یہ عیاری یہ ریلیں یہ طلسم قوت برقی اثر ہے آب و آتش میں کسی پوشیدہ طاقت کا

خدا حافظ ہے پھر ہے اختلاج قلب زوروں پر زمانہ آگیا نیرنگؔ اپنے دل کی شامت کا (۱۹)

ہلالؔ:۔ جناب منشی بال گوبند ہلالؔ تلمیذ حضرت نیرنگؔ کاکوروی۔ تعداد اشعار چار

ہمیشہ شوق رہتا ہے مرے دل میں اطاعت کا میں وہ بندہ ہوں جس کو فخر ہے آقا کی خدمت کا (۲۰)

شعرائے کرام کی ان طرحی غزلیات کے بعد رسالہ ہٰذا کے آخری صفحہ پر دستور العمل اس انداز سے درج ہے

'دستور العمل'

(۱) شاعری کی کایا پلٹ فی الحال ہر تیسرے ماہ کے شروع ہفتہ میں ۳۲ صفحے y پر قلعہ معلیٰ جھالرا پاٹن راجپوتانہ سے

شایع ہوا کرے گا

(۲) اس کی قیمت عام شائقین سے عہ۲ر سالانہ وطلبہ سے ۱۲ر سالانہ ہوگی

(۳) خیر دلران کی خدمت میں دوسرا پرچہ وی۔پی روانہ ہوگا۔

(۴) انتخاب بذریعہ انتخابیہ کمیٹی ہوگا جس کے ممبر یہ ہیں:

(ا) عالی جناب صاحبزادہ محمد فیاض علی خاں فیاضؔ رئیس دوجانہ پریسیڈنٹ انجمن جھالاواڑ

(۲) افسر الشعراء جناب آغا خاں شاعر قزلباش دہلوی ایڈیٹر رسالہ آفتاب

(۳) عالی جناب مولانا عبدالوحید صاحب نیرنگؔ کاکوروی

(۴) عالی جناب لالہ منشی شمبھو دیال دانشؔ دہلوی رجسٹرار ریاست ہٰذا

(۵) عالی جناب حافظ محمد عالم گیر خاں صاحب کیفؔ ٹونکی

(۶) خاکسار سکریٹری

(۵) نظمیں علمی۔ادبی۔اخلاقی۔تمدنی۔معاشرتی وتاریخی ہوا کریں گی، پولٹیکل یا بہاریہ نظمیں درج نہ کی جائیں گی۔

(۶) جن رؤسا ومشہور بزرگان کی خدمت میں یہ رسالہ جھالاواڑ سے باہر بلاطلب روانہ ہوگا ان سے قیمت کا بھی تقاضہ نہ کیا جائے گا۔البتہ بطور امداد وہ جو کچھ عطا فرمائیں گے شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا

(۷) دس یا دس سے زیادہ خریدار بہم پہنچانے والے حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ ایک سال تک مفت بھیجا جائے گا۔

(۸) جملہ خط وکتابت وترسیل زر سکریٹری رسالہ ہٰذا کے نام سے ہونا چاہئے۔

سید مصطفیٰ حسین رضوی سکریٹری انجمن سخن

آخری صفحہ کی اس پشت پر رسالہ 'آفتاب' کا اشتہار درج ہے اسی کے ساتھ رسالہ ہٰذا کا اختتام ہوا ہے۔

مولانا حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ نے جس طرح ۱۸۷۴ء میں انجمن لاہور کے زیر اہتمام نئی شاعری کا آغاز ہوا اور نظم گوئی کی بنیاد ڈالی گئی۔شاعری کو مقصدی اور افادی بنایا گیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے اخلاقی اور سماجی اصلاح کا کام بھی

لیا جانے لگا مذموم اور فرسودہ خیالات و رسوم سے انحراف پر بھی زور دیا گیا اسی طرح والیٔ ریاست جھالاواڑ راج رانا بھوانی سنگھ نے بھی یہ بات محسوس کی اور ریاست کے بعض شعرائے کرام کو ایسی نظمیں لکھنے کی تلقین کی گئی جس سے ملک وقوم کو فائدہ پہنچے اور ان کے اخلاق و اطوار کو سدھارنے میں مدد ملے، چنانچہ والیٔ ریاست کی اس تلقین کو قبول کرتے ہوئے نظم گوئی کی طرف خاص توجہ کی گئی اور اسی جذبہ کے تحت سہ ماہی رسالہ 'شاعری کی کایا پلٹ' جاری ہوا۔

حواشی:۔

(۱) دیباچہ اردو شاعری کی کایا پلٹ مدیر سید مصطفیٰ حسین رضوی ص۵

(۲) رسالہ اردو شاعری کی کایا پلٹ مدیر سید مصطفیٰ حسین رضوی ص۵

(۳) ایضا ص۷
(۴) ایضا ص۹
(۵) ایضا ص۱۷
(۶) ایضا ص۲۰
(۷) ایضا ص۲۹
(۸) ایضا ص۳۱
(۹) ایضا ص۳۱
(۱۰) ایضا ص۳۲
(۱۱) ایضا ص۳۲
(۱۲) ایضا ص۳۲
(۱۳) ایضا ص۳۲
(۱۴) ایضا ص۳۳
(۱۵) ایضا ص۳۴
(۱۶) ایضا ص۳۴
(۱۷) ایضا ص۳۵
(۱۸) ایضا ص۳۵
(۱۹) ایضا ص۳۵
(۲۰) ایضا ص۳۶

☆☆☆☆☆

انیس شناسی کا علم بردار: ضمیر اختر نقوی

ڈاکٹر حسن مثنیٰ
صدر شعبہ اردو رانچی کالج رانچی

اگر انیسؔ اور پاکستان کے حوالے سے بات کی جائے تو ہمیں اس سر زمین پر علامہ ضمیر اختر نقوی نمایاں ترین نظر آئیں گے کہ وہاں ان کی ذات تنہا انجمن کا درجہ رکھتی ہے جو برسوں سے انیس شناسی کو اپنا مشن بنائے ہوئے ہیں۔ اس کام کا آغاز انہوں نے ۱۹۷۱ء میں 'میر انیس اکیڈمی' قائم کر کے کیا تھا۔۔۔ خدا کرے صف سرداداگاں نہ ہو خالی۔۔۔ جو تو گرے تو کوئی دوسرا نکل آئے۔ ان کا بیان ہے کہ اس ضمن میں تمنا کا پہلا قدم انجمن یادگار انیس کے زیر اہتمام 'یادگار انیس' نامی مجلّہ کی اشاعت تھا جو انیس صد سالہ یادگار کے موقع پر ظہور پذیر ہوا۔ یہ مجلّہ انیس شناسوں کے لئے یقیناً ایک یادگار تحفہ تھا۔ اس کے علاوہ 'ماہ نو' ۱۹۷۲ء کا انیس نمبر پھر اسی سال 'سیپ' کا انیس نمبر اور پاکستان کا کثیر الاشاعت اور نہایت معروف ہفتہ وار 'الحید ر' کا محرم نمبر شائع کرا کے انہوں نے اس سمت میں پیش قدمی کی۔ اسی ۱۹۷۳ء میں 'پیام عمل' کا انیس نمبر شایع ہونا ایک بڑا علمی و ادبی کام تھا جسے وہ بخوبی انجام دے گئے اور اسی سبب سے آج بھی ان کی شناخت انیس شناس کے طور پر ہوتی ہے بلکہ عالم یہ ہے کہ وہ انیس شناسی کے ضمن میں بطور سند پیش کئے جاتے ہیں کہ بقول شخصے وہ 'میر انیس کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہیں'۔

اس میں شک نہیں کہ علامہ ضمیر اختر نقوی انیس شناسی کے باب میں ایک اہم اور منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اس میں ان کی تقریریں، مجالس اور مقالے وغیرہ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ سبھی اس بات کے غماز ہیں کہ وہ انیس کے حوالے سے ہی سہی من جملہ تمام اصناف شعر وادب پر خاصی گہری نظر رکھتے ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں کلاسیکی اور جدید ادب پر جس قدر کام ہوا ہے اسے خوش آئند قرار دیا جانا چاہئے لیکن انیس سے متعلق ابھی بھی نہ جانے کتنے گوشے تشنۂ تقریر ہیں۔ ایسے میں علامہ نے جس قدر دل سوزی اور لگن سے انیس کے تئیں اپنی خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف لازم ہے۔ خصوصاً پاکستان میں انیس شناسی کی جن جہتوں کی طرف توجہ کی جا رہی ہے اس میں ان کا خصوصی حصہ ہے۔ علامہ ایک ایسے ادیب، محقق اور خطیب ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنی تحریروں سے انیس شناسی میں معتد بہ اضافہ کیا ہے بلکہ قرآن اور میر انیس، میر انیس اور واقعۂ کربلا اور سورۂ یوسف اور میر انیس جیسے عناوین سے عشرۂ مجالس کو خطاب کر کے اسے مزید استوار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اس ضمن میں ہر صدی کا شاعر اعظم میر انیس، خاندان میر انیس کے نامور شعراء، کلام انیس میں

رنگوں کا استعمال، The Study of Elegies of Mir Anees اور میر انیس بحیثیت ماہر حیوانات اور نوادرات مرثیہ نگاری وغیرہ ایسی تصنیفات و تالیفات ہیں جن سے ان کی انیس شناسی کے جوہر کھلتے ہیں۔ مجھے ان کی چند تقریریں سننے کا موقع تو ملا ہی ہے مضامین پڑھنے کا بھی شرف حاصل رہا ہے، نیز میں نے ان سے یہ نفس نفیس ایک مقالہ بھی سن رکھا ہے جو انہوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'شاگردان دبیر کی ادبی خدمات' کے عنوان سے پڑھا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں 'انیس و دبیر' پر منعقدہ اس سیمینار پر مبنی مجموعہ مقالات استاد محترم پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ترتیب دے کر اسے ۲۰۰۷ء میں شائع کرا دیا ہے جسے ہم غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی فخریہ پیش کش قرار دے سکتے ہیں۔ بہر حال اس چند منٹ کے مقالے میں مجھے ان کی قراۃ، ان کا انداز، تحت اللفظ' متاثر کر گیا۔ مجھے کیا سبھی کو، کہ ایسا انداز تو آج کے بڑے بڑے مرثیہ خواں حضرات کے یہاں بھی ناپید ہوا جا رہا ہے۔ خیر یہ تو آنکھوں دیکھی اور کانوں سنیں باتیں تھیں جس پر یقین کرنا نہ کرنا قارئین پر منحصر ہے لیکن میں یہاں ان کی انیس شناسی پر انہیں کے چند اقتباسات کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہوں گا۔ جو انہوں نے اپنی انیس شناسی کے ثبوت کے طور پر صفحہ قرطاس پر رقم کئے ہیں۔ سب سے پہلے ان کا یہ بیان:

> 'جس نے میر انیس کو نہیں پڑھا وہ شاعری نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میر انیس کے مرثئے بیک وقت غزل، نظم حزنیہ، رزمیہ، طربیہ اور رثائیہ شاعری کا مرقع ہیں۔ میر انیس کو پڑھنے اور سننے کے بعد شاعر کی حس تخلیق متحرک ہو جاتی ہے' (۱)

یہاں علامہ ضمیر اختر نقوی کے اس بیان پر بھی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے جس میں انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ غالبؔ بھلے ہی سب کے دلوں میں بستے ہوں، سبھی ان کے مداح ہوں لیکن انیسؔ میں ضرور کوئی بات ایسی ہے کہ خود غالبؔ جیسا عظیم شاعر انیس کا مداح نظر آتا ہے:

> '۔۔۔مضامین بتاتے ہیں کہ دنیا میں کسی بھی صاحب فن پر اتنا کام نہیں ہوا ہوگا جتنا مرزا غالب کے بعد میر انیس پر ہوا ہے، لیکن یہاں خاصے کی بات یہ ہے کہ مرزا غالبؔ بھی میر انیس کے مداح ہیں۔ میر انیس فن کی ان بلندیوں پر ہیں کہ جہاں دنیا بھر کے مختلف النسل شعراء اور مفکرین پست نظر آتے ہیں' (۲)

ان تعریفی کلمات سے قطع نظر ان کی نگاہ ناقدین انیس کے رشحات قلم پر بھی ہے اور وہ حتی الامکان ان کے منطقی جواب سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مثلاً جب ایک ناقد انیس نے ان کی سراپا نگاری پر یہ کہہ کر الزام لگایا کہ ایسا کرتے وقت وہ

لکھنوی غزلیت کے شکار ہو گئے تب انہوں نے اس کا بھر پور جواب دیا۔ ملاحظہ فرمائیں علامہ ضمیر اختر نقوی کا یہ اقتباس جس سے اس امر کی مزید وضاحت ہوتی ہے:

'میر انیس نے کربلا کے ہر مجاہد کا سراپا لکھا ہے۔ ان کے نقادان پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ سراپا لکھتے ہوئے انیس نے خاص لکھنوی غزلیت کو شامل کیا ہے، لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہاشمی مرتبت کے گھرانے والے وجیہ و شکیل تھے۔ اولاد ابوطالب حسن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ میر انیس نے جناب عباس کی خوبصورتی کی جتنی تعریف کی ہے وہ جناب عباس کے حسن خداداد سے کہیں کم ہے' (۳)

مرثیہ نگاری کے تمام اجزاء میں سراپا نگاری پر تمام مرثیہ گویوں نے خاصی مشقت کی ہے۔ میری دانست میں اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے اگر کسی کا خوبصورت سراپا پیش کر دیا جائے تو اس کی موت یا شہادت پر خود بخود آنسو بہہ نکلتے ہیں، جسے کہ مرثیہ نگار مآل مجلس سمجھا کرتے ہیں۔ انیس نے اس میدان میں بھی اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ میں اس مفروضہ سے متفق نہیں ہوں کیوں کہ انہوں نے واقعۂ کربلا، سرزمین عرب سے لیا تھا، کردار (قمر بنی ہاشم) وہاں سے لئے تھے لیکن اسے ہندوستانی قالب میں ڈھال کر پیش کیا تھا تا کہ اس میں زور پیدا کیا جا سکے کہ یہی ان کا مقصد تھا۔ ترسیل و ابلاغ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہی طریقہ احسن تھا کیوں کہ اگر وہ اس وقعہ کو عرب پس منظر میں بیان کرتے تو اس میں وہ تأثر نہ آپاتا یعنی Proximity نہیں پائی جاتی اور جس طرح دور کی خبر کو ہم اتنیہ اہمیت نہیں دیتے خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو شاید وہی حال واقعہ کربلا کا بھی ہوتا۔ انیس نے اسے ہندوستانی قالب میں ڈھال کر اپنے سامع اور قاری سے ایک ذہنی ربط پیدا کر دیا کہ یہی ان کا کمال فن ہے، خواہ ایسے میں وہ سراپا نگاری کے عمل سے گزر رہے ہوں کہ منظر نگاری یا پھر دیگر صنائع و بدائع سے اپنے فن کا جوہر دکھایا ہو، سبھی جگہ وہ کامیاب و کامران رہے ہیں۔ ہاں اس واقعہ سے مذہبی وابستگی نے بھی ان کے فن کو فروغ دیا اس میں کلام نہیں کہ یہ ساری باتیں سامعین کے جذبات پر اثر انداز ہونے میں کامیاب رہیں اور انیس کے حق میں بھی، جبھی تو وہ آج بھی سب کے دلوں میں بستے ہیں

یہاں علامہ کی ایک اور تصنیف 'میر انیس بحیثیت ماہر حیوانات' کے حوالے سے بات کی جائے تو انیس پر لگائے گئے الزام کی مزید تردید ہو جائے گی کہ انیس نے اپنے کلام بلاغت نظام میں عراق کی سرزمین پر واقع جنگ کربلا کو موضوع بناتے ہوئے ان جانوروں کا ذکر بھی کیا ہے جو وہاں پائے ہی نہیں جاتے مثلاً گینڈا جو ہندوچین میں پایا جانے والا جانور ہے، انیس

نے اس کی کھال کا تذکرہ کیا ہے جس سے سپر بنائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہاتھی جو خالص ہندوستانی جانور ہے اس سے بھی انہوں نے اپنے کلام میں زور پیدا کیا ہے اسے ہم واقعہ میں Proximity پیدا کرنا ہی قرار دیں گے کہ وہ شئے جو وہاں پائی ہی نہیں جاتی اسے اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ ہمیں ان کی اس عطا کو اپنا سرمایہ گردا ننا چاہیے۔ میری نظر میں ان پر لگائے جانے والے اس قسم کے الزام بلکہ بے جا تنقیدوں سے اجتناب برتنا چاہیے کہ یہ چیزیں ادب میں زیب نہیں دیتیں۔ حق تو یہ ہے کہ ناقدین انیس کو ضمیر اختر نقوی کے اس قول کی روشنی میں بھی ان کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ایسے میں ہم ایک منفرد انیس کو بھی تلاش کر سکتے ہیں:

> '۔۔۔ان کی شاعری میں گھوڑے کے بارے میں سب سے زیادہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ گھوڑے کے بعد انہوں نے سب سے زیادہ جس جانور کا ذکر کیا ہے وہ شیر ہے۔۔میر انیس کی شاعری میں ہاتھی طاقت کا سمبل ہے لیکن امام حسین کے لشکر کے مجاہدوں کے لئے وہ چیونٹی سے بھی کم تر ہے۔۔۔ بھیڑیا، لومڑی، گینڈا اور چیتا بھی امام حسین کے دشمنوں کے لئے مثال میں میر انیس لے کر آتے ہیں۔ بھیڑیا اپنی خباثت اور درندگی کے ساتھ، لومڑی (روباہ) مکاری اور عیاری کے ساتھ کلام انیس میں موجود ہے(۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہو گیا کہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کے مراثی کا کس قدر عمیق مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے کس کس نہج سے ان کو جانچا پرکھا اور سمجھا ہے۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مراثی میں نماز کے حوالے سے چار مناظر کی نشان دہی کی ہے اور یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ انیس نے ان تمام مناظر کو، ان سے وابستہ جزئیات کو کس قدر منفرد رنگ میں پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ انیس کا دعویٰ کہ 'اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں' شعری تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ دیکھیں یہ اقتباس جو ان کی انیس شناسی پر دلالت کرتے ہیں:

> 'میر اانیس کے کربلا کے ایک ایک منظر کے جزئیات پیش کر کے ہم کو عبادت خدا کا شوق دلایا ہے اور ان مقدس بزرگواروں کے اوصاف کی جھلک ہمارے دلوں میں رونما کرنے کی کوشش کی ہے'(۵)
>
> 'تیمّم، اذان، اقامت،، نیت، تخشع، تضرع، قیام، قعود، رکوع، سجود، قنوت، تشہد، سلام، درود، دعا غرض تمام ارکان نماز کو انیس نے شاعری کا جزو بنا دیا۔ یہ بات اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ہے'(۶)

اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے علامہ نے کلام انیس سے کئی بند پیش کئے ہیں ،تا کہ قارئین ان بندوں کے سہارے اس منظراور پس منظر سے واقف ہو جائیں ۔جس کا ذکر مقصود ہے۔ان میں سب سے پہلا منظر تو شب عاشور کا ہے جس میں انیس نے دکھایا ہے کہ فوج یزیداورامام حسین کے درمیان صلح کی تمام امیدیں دم توڑ چکی ہیں بلکہ عمر سعد عنقریب حملہ آور ہونے والا ہے۔ایسے نازک موقع پر بھی امام عالی مقام نے کس طرح نماز کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، نیز یہ بھی کہ اپنے رفقاء کے ساتھ کس طرح عبادت الٰہی میں منہمک رہے۔اسی مقصد کی خاطر ایک شب کی مہلت طلب کی گئی تا کہ جی بھر کے عبادت خدا کی جا سکے۔ بقول انیس

فرمایا بڑا اجر ہے بیداریٔ شب کا
اے تشنہ لب و وقت ہے یہ طاعت رب کا

انہوں نے اس مضمون میں دوسرا منظر نماز صبح کے حوالے سے پیش کیا ہے اور ہم پر یہ باور کرایا ہے کہ یہاں انیس نے جناب علی اکبر کی اذان کے ذریعہ ایک نیا نکتہ پیش کیا ہے،ایک نیا منظر نامہ تخلیق دیا ہے۔

جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے سجدوں میں مہم عشق کی سر کی شہ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دیں نے مڑ کر رخ اکبر پہ نظر کی شہ دیں نے

فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

میر انیس کے مراثی کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کم از کم پانچ مراثی میں اس قسم کے مناظر پیش کئے ہیں۔ یہاں بھی ان کی فن کاری اپنے عروج پر ہے کہ ہر بار مضمون جدا جدا ہے۔علامہ نے انیس کے یہاں نماز ظہر کا ذکر بھی بڑی خوبی و درا کی سے کیا ہے کیوں کہ یہ وہ وقت ہے جب جنگ شروع ہو چکی ہے۔امام اوران کے ہمنوا جام شہادت نوش فرمانے کے لئے آمادۂ پیکار ہیں کہ اسی دوران ایک صحابی ابوثمامہ صیداوی امام کی اقتدا میں آخری نماز کی خواہش ظاہر کرتا ہے مولا نماز کی مہلت کے لئے جنگ روکنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن فوج یزید اس پر راضی نہیں ہوتی تب امام تیروں کے سائے میں اپنے انصار واصحاب کے ساتھ نماز ظہر ادا کرتے ہیں، کہ یہ نماز تاریخ انسانیت کی عجیب وغریب نماز بن جائے،ایک ایسی عبادت جو رضائے الٰہی کے لئے کی گئی ہو۔اگر ایک طرف دشمن تیر وتفنگ و برچھی و سنان سے لیس جنگ جیتنے کی ان تھک

کوشش میں مصروف ہیں تو دوسری جانب امام اوران کے انصار نماز قائم کر کے دین الٰہی کی بقا کے لئے جہاد زندگانی کا پیغام دے رہے ہیں یعنی وہ یہ پیغام عام کرنے میں کامیاب رہے کہ ان کی جنگ اور عبادت سبھی کچھ رضائے الٰہی کے لئے ہے۔ یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ جنگ کربلا میں دونوں ہی جانب کلمہ گویان نبی تھے۔خواہ وہ یزید ابن معاویہ کے گروہ کی افواج ہوں کہ حسین ابن علی کے جیالے لیکن انہیں پاس عبادت خدا نہ تھا، جب کہ امام اوران کے حامیوں کے لئے اس ہنگامی ماحول میں بھی نماز کی اس قدر اہمیت تھی کہ بھلے ہی جان جان آفریں کے سپرد ہی کیوں نہ کرنی پڑے،نماز قائم رہے دین اسلام کا پیغام عام ہوتا رہے۔انیس نے یہاں بھی اپنی صناعی اورفن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں یہ بند:

فکر نماز ظہر میں تھے یاں امام دیں واں ہل رہی تھی نالہ شہنا سے سب زمیں
غل اقتلوالحسین کا کرتے تھے اہل کیں تھے منحرف جو قبلۂ ایماں سے وہ لعیں
دشمن تھی سب سپاہ شہ سرفراز کی
ملتی نہ تھی امام کو مہلت نماز کی

نقوی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انیس کے مراثی غوطہ زن ہوتے وقت اوراس پرغوروفکر کرتے وقت اس قدر دقت نظر کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ وہ اس میں بھی ایک منفرد لہجہ کی طرف ہمارا ذہن مبذول کرا گئے کہ اسے کلام انیس کی غواصی کا بہترین اورمنفرد عمل قرار دیا جانا چاہیے۔آیئے اب انیس کے مراثی کے آخری منظر یعنی نماز عصر پر توجہ کی جائے کہ یہ نماز امام نے یکہ وتنہا ادا کی تھی۔اس ساعت نماز میں نہ ان کے باوفا اصحاب تھے نہ ہی عزیز واقارب، ہاں ان کی شہادت کے داغ اور داغ مفارقت ضرور تھے۔یہ وہ وقت تھا جب امام تیروں،تلواروں اور نیزوں سے نبرد آزما ہوتے ہوتے زخموں سے چور ہو چکے تھے۔نیز یہ بھی کہ یہی وہ وقت تھا جب فوج یزید سے بار بار الامان والحفیظ کی صدائیں بھی آ رہی تھیں۔انہیں ان کے آباء واجداد کے نام پر جنگ سے باز آنے کی دہائی دی جارہی تھی،قاسم وعباس واکبر جیسے عظیم شہداء کی قسمیں دی جا رہی تھیں جو ابھی ابھی قتل کئے گئے تھے۔ایسے میں جب ندائے غیبی آئی تو امام نے تلوار نیام میں رکھی آسمان کی جانب نگاہ کی کہ نہ اب کوئی اذان دینے والا تھا نہ ہی صف بچھانے والا اور نہ ہی صفوں کی حفاظت کرنے والا۔امام نے سر کو سجدے میں جھکا دیا 'سجدہ تہہ شمشیر ادا کرتا ہے شبیر' تا کہ ہنگام عصر بھی نماز عصر ادا کی جا سکے۔دیکھیں یہ بند جسے انیس نے بڑے ہی دلدوز انداز میں رقم کیا ہے:

ہے عصر کا ہنگام مناسب ہے اترنا اس خاک پہ ہے شکر کا سجدہ ہمیں کرنا
گو مرحلہ صعب ہے دنیا سے گزرنا سجدے میں کٹے سر کہ سعادت ہے یہ مرنا
طاعت میں خدا کی نہیں صرفہ تن و سر کا
ذی حق ہیں ہمیں اس کے کہ ورثہ ہے پدر کا

آخر میں میں اپنی بات انہیں کے ایک معرکتہ الآرا مضمون 'میر انیس کے مرثیوں میں عباس کا علم' کے اس اقتباس پر تمام کرتا ہوں کہ:

'اردو شاعری کا علم میر انیس کا تھا اور میر انیس کا ہے قیامت تک یہ علم میر انیس کے نام سے بلند رہے گا'

اس مضمون کو اس نتیجہ پر ختم کرنا کہ جس میں انہوں نے انیس کو اردو شاعری کا علبردار قرار دیا ہے۔اپنے اندر ایک خاص قسم کی معنویت اور تہہ داری رکھتا ہے جس پر ناقدین ادب یقیناً اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔میری نظر میں اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ انیس کی شاعری میں شعر وسخن کی وہ تمام خوبیاں یک جا ہوگئی ہیں جسے پڑھنے کے بعد ہم اپنی تخلیقی وتنقیدی حسیت کو مہمیز کر سکتے ہیں۔اس کے سہارے ادب کی پرکھ اور پہچان کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں کہ یہی پیغام انیس تھا۔

مآخذ:

(۱) منادیٔ انیس: ہر صدی کا شاعر اعظم میر انیس ص ۱۶

(۲) پیش لفظ: ہر صدی کا شاعر اعظم میر انیس ص ۲۴

(۳) میر انیس کے مرثیوں میں عباس کا علم: ہر صدی کا شاعر اعظم میر انیس ص ۱۳۲

(۴) پیش لفظ: میر انیس بحیثیت ماہر حیوانات

(۵) ضمیر اختر نقوی: حسین اور نماز میر انیس کی نظر میں: ہر صدی کا شاعر اعظم میر انیس ص ۲۰۹

(۶) ضمیر اختر نقوی: حسین اور نماز میر انیس کی نظر میں: ہر صدی کا شاعر اعظم میر انیس ص ۲۱۴

☆☆☆☆☆